انتساب نظیر

تحقیقی و ادبی مضامین کا مجموعہ

مؤلفہ

راھی فدائی

ابو الحسنات اکاڈمی۔ کڈپہ (اے پی)

کتاب	اکتسابِ نظر
مصنف	ظہیر احمد باقوی راہی فدائی
تعداد	۷۸۶
قیمت	چالیس روپے =/Rs. 40
سالِ اشاعت	1412ھ مطابق 1991ء
مطبع	کتب خانہ عزیزیہ۔ اردو بازار، دہلی ۶
ناشر	ابوالحسان اکاڈمی۔ کڈپہ (اے پی)
پتہ	184/6 برہان الدین اسٹریٹ۔ کڈپہ (اے پی) 516001
کتابت	نصرت سعید، وانم باڑی اور حسینی مدراس
سرورق	جناب قیصر سرمست
زیرِ اہتمام	علیم صبا نویدی

۲۶۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ۔ ماؤنٹ روڈ۔ مدراس ۲

تقسیم کار:

کتب خانہ عزیزیہ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

انتساب

بنام

رہبرِ راہِ تحقیق، صدیقِ شفیق، محترمی ومکرمی

جناب ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب زید اقبالہ

پروفیسر ایس۔ وی۔ یونیورسٹی۔ تروپتی آندھرا پردیش

ترتیب

پیش لفظ ڈاکٹر محمد علی اثر
تعارف ڈاکٹر غیاث اقبال

مضامین

- ولی دیلوری
- مثنوی "یوسف زلیخا" کا ایک نودریافت مخطوطہ
- مولانا ذوالفقار علی خان اختر کڈپوی اور آپ کی مثنوی "در مدحِ ٹیپو سلطان"
- وشارم میں اردو کا ارتقاء
- جنگِ آزادی اور علمائے جنوب
- خطوط نگاری
- شہنشاہِ تشبیہات ـــــ جناب ساغر جنیدی
- جناب علیم صبا نویدی کی نعت گوئی
- اثر خامۂ علیم صبا نویدی

تاثرات علیم صبا نویدی

• ڈاکٹر محمد علی اثر

پیش لفظ

اردو کے ادبی حلقوں میں راہی فدائی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں کے ذریعے، جدید اردو شاعری کو نئی نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ غزل میں مخصوص لفظیات اور تراکیب، جو جدید شاعر کے لئے بھی 'شجر ممنوع' کی حیثیت رکھتی ہیں، راہی فدائی نے انہیں بڑی بے تکلفی سے برتا ہے۔ اس خصوص میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے بعض غیر سنجیدہ الفاظ بھی سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ برتے ہیں۔ اور اس طرح اردو غزل کے خزینۂ لفظیات کو وسعت عطا کی ہے۔ عربی اور فارسی کی مخصوص لفظیات اور انوکھی تراکیب کے علاوہ راہی صاحب کا طرزِ فکر اور اسلوب بیان بھی دوسرے جدید شاعروں کے مقابلے میں، ابتدا ہی سے مختلف اور منفرد رہا ہے۔ ان کی شاعری کے مجموعے "لہجے"۔ "انتسلہ"۔ "تصنیف"۔ "انامل" اور "ترقیم" جدید اردو غزل کے سرمایے میں قابلِ احترام اضافہ ہیں۔ راہی فدائی نے غزلوں کے علاوہ اپنے مخصوص انداز میں نظمیں بھی کہی ہیں لیکن وہ تعداد میں نسبتاً کم ہیں اور ان کی شعری شناخت غزلوں کی بنا پر رہی ہے۔

مشرقی علوم اور ادبیات کے گہرے مطالعہ نے راہی صاحب کی شاعری کو بجا طور پر وزن و وقار عطا کیا ہے، لیکن اس کے راست اظہار کے لئے نثر ہی موزوں ترین پیرایہ ہے۔ جس سے اردو کے عام قارئین بھی وسیع پیمانے پر استفادہ کرسکتے ہیں۔

ادھر کچھ عرصے میں راہی فدائی نے نثر نگاری کی طرف باقاعدہ توجہ دی ہے۔ شعری مجموعوں کے قطع نظر ان کی دو تالیفات "باقیات۔ ایک جہاں" اور "تجزیہ" شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کے تحقیقی و تنقیدی مقالے اور مضامین بھی وقتاً فوقتاً مختلف علمی و ادبی جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب "اکتسابِ نظر" میں انہیں مضامین اور مقالات کو یکجا کیا گیا ہے۔

"اکتسابِ نظر" میں شامل مضامین کو موضوعاتی اعتبار سے تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ابتدائی پانچ مضامین "ولی ویلوری" "مثنوی یوسف زلیخا" کا ایک نو دریافت مخطوطہ" "وشارم میں اردو" "اختر کڈپوی اور انکی مثنوی درمدح ٹیپو سلطان شہید" اور "جنگ آزادی اور علمائے جنوب" تحقیقاتی ہیں۔ "خطوط نگاری" سے متعلق مضمون فنی نوعیت کا ہے اور تین مضامین "شہنشاہِ تشبیہات جناب ساغر جیدی صاحب" "علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری" "اثرِ خامۂ علیم صبا نویدی" تنقیدی تبصرہ بلکہ تعارف کا انداز لئے ہوئے ہیں۔

شاعر، ادیب اور فن کار کا اپنے علاقائی ادب سے دلچسپی لینا ایک فطری بات ہے۔ راہی فدائی نے اپنے وسیع مطالعہ اور گہرے مشاہدے کے تحت، اردو ادب کے شیدائیوں کے لئے، جنوب کے ادب کے بارے میں عمومی اور اپنے آبائی وطن کڈپہ کے شاعروں اور ادیبوں کے تعلق سے خصوصی طور پر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کے بیشتر مضامین اگرچہ ایک مخصوص علاقے کے ادیبوں اور شاعروں

پر محیط ہیں لیکن ان کا دائرہ تحقیق اور اندازِ نظر محدود نہیں ۔ اپنے تحقیقی انکشافات کو راہی فدائی نے مستند ماخذ اور معتبر حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے، نئے گوشے بھی وا کیے ہیں۔

"اکتسابِ نظر" کا پہلا مقالہ "ولی ویلوری" سے متعلق ہے جس میں شاعر کی تصانیف مثنوی "رتن پدم"، "روضۃ الشہداء"، "روضۃ الانوار" "روضۃ العقبیٰ" اور "دعائے فاطمہ" کے تعارف کے علاوہ، اس کے واقعات حیات اور مدفن کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں راہی فدائی نے ولی ویلوری کی پانچ تصانیف کی فہرست دی ہے۔ اس میں ان کی دو مثنویاں "تنبیہ نامہ" اور "اگر وملاگیر" شامل ہونے سے رہ گئی ہیں ۔ اول الذکر قلمی کتاب کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانۂ خاص کی زینت ہے۔ جس کا تذکرہ مولوی افسر صدیقی امروہوی نے "فہرست مخطوطات انجمن ترقی اردو کراچی" کی پہلی جلد میں ص ۴۵۹ پر، چھٹی جلد میں صفحہ ۱۹۲-۱۹۳ پر اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے "قدیم اردو کی لغت" میں صفحہ ۲۳۶ پر کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا مقالہ "مثنوی یوسف زلیخا" کا ایک نو دریافت مخطوطہ" بہت ہی اہم اور معلومات افزا ہے، ہاشمی بیجاپوری کی معرکۃ آرا "مثنوی یوسف زلیخا" کا نو دریافت مخطوطہ دکنیات کے محققین کے لئے مژدۂ جاں فزا سے کم نہیں ہے۔

کتاب کا تیسرا پر مغز مقالہ "مولانا ذوالفقار علی اختر کڈپوی اور ان کی مثنوی در مدح ٹیپو سلطان شہیدؒ کے موضوع پر ہے۔ اس میں مولانا اختر کڈپوی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے قلمی دیوان کا تعارف کرواتے ہوئے۔ دیوان میں موجود "حضرت ٹیپو سلطان شہید کی تعریف میں کہی گئی مثنوی کا مفصل

جائزہ لیا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ جناب راہی نے بڑی محنت اور جاں فشانی سے سپردِ قلم کیا ہے۔

چوتھے مقالے "وشارم میں اردو کا ارتقاء" میں، سرزمینِ وشارم کے چند ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "شہر وشارم" جس کا قدیم نام "حراست پور" تھا، کی وجہ تسمیہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا پانچواں مقالہ "جنگ آزادی اور علمائے جنوب" پر مبنی ہے، راہی صاحب نے برطانوی عہد میں جنوب کے علمائے اسلام کی، مذہب کے تحفظ اور بقا کے سلسلے میں کی گئی کوششوں کو دستاویزی انداز میں قلم بند کیا ہے۔ یہ مقالہ ادب کے علاوہ جنوب کی تاریخ اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی خاصے کی چیز ہے۔

فنی نوعیت کا مضمون "خطوط نگاری" اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اردو میں ادبی اصناف کے تعلق سے خالص اور ٹھوس مضامین و مقالات شاذ و نادر ہی لکھے جاتے ہیں۔

"اکتسابِ نظر" کے آخری تین مضامین دورِ جدید کے معتبر و مقبول شعراء جناب ساغر جیدی اور جناب علیم صبا نویدی سے متعلق ہیں۔ ان مضامین کی حیثیت تعارفی زیادہ ہے اور تنقیدی کم۔ صبا نویدی، بحیثیت شاعر راہی فدائی کی طرح، ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کے قارئین اور ناقدین نے ابتدا ہی سے علیم صبا نویدی کے کلام کو، جس کا وہ مستحق ہے، پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے حالیہ شعری مجموعوں کا تعارف، راہی فدائی کے قلم سے، دوہری اہمیت کا حامل ہے۔ اول تو یہ کہ مذہبی حیثیت صبا نویدی کے نعتیہ کلام اور راہی فدائی کی شخصیت دونوں میں مشترک ہے۔ دوسرا یہ کہ راہی فدائی شخصی طور پر علیم صبا نویدی سے قریبی روابط رکھتے ہیں۔

"اکتسابِ نظر" کی اشاعت پر میں راہیؔ فدائی صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی، اس سے بہتر تحقیقی، علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی اہمیت کے مقالات ضبط تحریر میں لاتے رہیں گے، اور اپنے علمی نتائج و افکار سے اردو قارئین کے وسیع حلقوں کو استفادہ کے مواقع فراہم کرتے رہیں گے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

محمد علی اثر

۲۸ اگست ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر غیاث اقبال

تعارف

انامل اور ترقیم کی شعری کائنات کا خالق راہی فدائی میرا ہم وطن بھی ہے اور میرا بے تکلف معقول دوست بھی۔ زیرِ نظر نثر پارے خود اُس کے تعارفِ معنوی کے لئے کافی تھے۔ مگر کیا کریں کہ آخر یہ شخص بھی زیرِ سرگشتہ خمار رسوم قیود نکلا " اور مرز بوم کے رشتے نے مجھے بھی مجبور کیا کہ تعارف کے بہانے، خود تعارفی، کے کارِ خیر میں شریک ہو جاؤں اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے مقدمہ باز ہونے سے بچا لیا اس طرح مقدمہ کی پیروی محترم اثر صاحب کے حِصّے میں آئی۔ حق بہ حق دار رسید، والا محاورہ شاید ایسے ہی تناظر کے لئے خلق ہوا ہو!

راہی ' جُبّہ و دستار ' کے احساساتی و احساسی حلقے کا پروردہ ہے مذہبی اور تہذیبی معاملاتِ زندگی میں نہ مصلحتوں کا پاس رکھتا ہے اور نہ بے جا منافقت کا روادار! وہ مُقلّد بھی ہے مگر علمائے جمہور سے قُربت بھی رکھتا ہے۔ سب سے انوکھی بات تو یہ ہے کہ وہ فرد بھی ہے اور فن کار بھی۔ اظہار ذات کے ذیل میں اُس نے ابتدا شعر گوئی سے کی مگر ذات اپنے بھرپور اظہار کے لئے تمام اصناف ادب کی طالب ہوا کرتی ہے سو نثر نگاری کی جانب اُس کی حالیہ پیش قدمی نہ صرف اظہار ذات کا ایک وسیلہ ہے بل کہ اُس کے اندر متمکن جذبۂ سیاحت اور سنجیدہ ذوقِ جستجو کی معنوی تجسیم بھی ہے اور پُر وقار اعلامیہ بھی۔

اس مجموعے میں شامل بیشتر مقالے تحقیق اور جستجو کی بلند سطح سے منسلک

ہیں مثلاً راہی نے اختر کڈپوی کی رقم کردہ فارسی مثنوی کو پہلی بار اردو دنیا سے روشناس کرایا ہے۔ نیک نام آباد (کڈپہ) ولی ویلوری اور مثنوی رتن پدم کی ترتیم کے رشتوں کو تلاشا ہے اور کڈپہ شہر کی ایک ایسی مستند ادبی تاریخ رقم کرنے کی بلند سعی سے ہم کنار ہوا ہے جو اُس کے موضوع تحقیق کا منشا بھی ہے اور اس کی منزل بھی۔ (راہی ایس وی یونیورسٹی شعبہ اردو کا ریسرچ اسکالر ہے) وشارم میں اُردو رقم کرتے ہوئے اُس نے ادب کے وسیلے سے تاریخی حقائق کی تہہ تک رسائی کی کوشش کی ہے اور مخزونہ سدھوٹ کے نادر ونایاب مخطوطے انشائے حراست ضائع، کا نادر حوالہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تحقیق کے ضمن میں راہی نے اپنے دامن میں امکانات کی ایک ممکنہ وسعت کو سمیٹ رکھا ہے۔ "وشارم میں اردو" مقالے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اُس نے اس موضوع پر رقم کردہ دیگر تصانیف کے اَوراق اُلٹنے کی بجائے اُن ادبی ماخذات کی تلاش کی ہے جن میں بنیادی ساخت کے ایک ایسے حوالے موجود ہیں جو "حراست پور" کی وجہ تسمیہ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ راہی نے ساختیاتی طرز تحقیق وتنقید کو اپنایا ہے۔ بہ ایں ہمہ اتنا تو ہے کہ متن کے عقب میں موجود اُن حقایق تک رسائی کی سعی شامل ہے جو ثمر آور ثابت ہوئی ہے۔ اس طرز تحقیق کو حرز جاں بنانے والا راہی فدائی قابل مبارک باد ہے جو تحقیق کو دوبارہ اُس کی عظمت، سنجیدگی اور وقار بخشنے کے لئے کمربستہ ہے۔ زیرِ نظر تحقیقی مضامین میں راہی نے نہ صرف اپنے قلم کا سارا زور صرف کیا ہے بلکہ ان میں خون پسینے کا جوہر بھی شامل کیا ہے جس کے بغیر تحقیق کے ذیل میں آنے والی کوئی تحریر [LUMINOSITY] نہیں دے سکتی!

مقالہ "جنگ آزادی اور علمائے جنوب" کی قرائت سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اس مقالے کی ترتیم کا محرک اور منشا کیا تھا۔ "عزیمت" اور "ہزیمت"، کے تصور سے

ماورا ہونے کے باوجود علامہ اقبالؒ کا یہ شعر اپنی وقعت نبھا رہا تھا ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اِسلام ہے آزاد

اس تفصیل سے قطع نظر مضمون "خطوط نگاری" کا موضوع کچھ اکھرے انداز کا مطیع لگتا ہے استفسارات کے حوالے کے بغیر ان کے جوابات کو تجزیاتی مطالعے سے وابستہ کرنا وضاحت کے تقاضوں کو تشنۂ تکمیل ہی رکھنے کے مترادف ہے! اپنے ہم عصر علیم صبا نویدی کے شعری مجموعوں پر عالمانہ تبصرہ کرتے ہوئے راہی نے کہیں تجزیاتی، کہیں تاثراتی اور کہیں اسلوبیاتی رَوش اختیار کی ہے۔ اپنے ہم عصر کے فکروفن کے تعلق سے یہ مستحسن کوشش قابل داد ہے ان مضامین کا لہجہ اور رنگ، خطیبانہ طرزِ نگارش سے مملو ہے۔ چونکہ امکانات سے بھی نیک توقعات کی آرزو کرنا ادب کا شیوہ رہا ہے تو کیا ہم راہی سے یہ امید وابستہ رکھیں کہ وہ اپنی تحریر کو تقریر کے مزاج سے منہا کر دینے میں کام یاب ہوگا تو کیا غلطی کے مرتکب ہوں گے؟ تنقید کی مقدس سنجیدگی تو اسی کی متقاضی ہے!

راہی نے کہیں لکھا ہے "سرزمین کڈپہ صدیوں سے شعرا و ادبا اور اہلِ دل صوفیا کی ماوا و ملجا بنی رہی۔ آج بھی یہاں کے اہلِ قلم اپنی اس موروثی دولت کی حفاظت کو اپنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں"۔ میرے ہی مرزبوم کا یہ قلم کار خدا کرے کہ کڈپے کی مستند و معتبر ادبی و تنقیدی تاریخ کرنے میں کام یاب ہو۔ واقعی راہی کو کڈپے کا "باقیات الصالحات" کہنا ہمارے عہد کے ادبی و تنقیدی مورّخ کو اُس کے عظیم مقصد اور منصب کی یاد دہانی کرانا ہے اور خود کو باآوازِ بلند "جاگتے رہو" کی ہم کلامی سے منسلک کرنا ہے۔ اب اس تحریر کو آپ تعارف کہیں یا راہی کے لئے دیا ہوا استقبالیہ قرار دیں آپ کی صوابدید پر منحصر ہے!

غیاث اقبال

ولی ویلوری

اردوئے قدیم یعنی دکنی زبان کے دو اہم مراکز بیجا پور اور حیدر آباد کے بعد ویلور دارالسّرور کا ذکر خیر تاریخ ادبِ اردو میں بڑی اہمیت کا حامل اور زیادہ توجّہ کے قابل سمجھا گیا ہے۔

گیارھویں صدی ہجری کے اواخر میں علم وفضل کے معدن و مخزن بیجاپور وحیدرآباد کے لٹنے کے بعد ویلور اصحابِ کمال کے لئے درحقیقت دارالسّرور بنا رہا۔ یہ مردم خیز سرزمین ایک طرف حضرت قربیؔ جیسی مجمع البحرین شخصیت کی جلوہ گاہ تھی۔ تو دوسری طرف ولی ویلوری جیسے قدآور اور بلند پایہ سخن ور کی آماجگاہ رہی۔

ولیؔ ویلوری کا اسمِ گرامی سیّد محمد فیاض تھا۔ ولیؔ تخلص فرماتے تھے۔ ویلور وطنِ مالوف تھا آپ کو قربیؔ (۱۱۱۸ھ۔ ۱۱۸۳ھ) کی ہم عصری کا شرف حاصل رہا ہے۔ عہدِ عالمگیری کے ممتاز شعرائے اردو میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

ویلور سے تقریباً چالیس؟ میل کے فاصلے پر "سات گڑھ" ایک تاریخی مقام ہے۔ وہاں کے فیاض و نیک طینت صوبہ دار امیر حراست خان کی رفاقت و

صحبت میں ولی اپنی جوانی کے ابتدائی ایام خوش و خرم بتا رہے تھے۔ بقولِ ڈاکٹر افضل الدین اقبال وہ ابتداً فوج میں ملازم تھے، بہر حال اچانک چند نامساعد حالات اور ناگہانی حادثات کے سبب قضا و قدر کے ہاتھوں مجبور ہو کر "سات گڑھ" سے ہجرت کر کے انھیں شہر کڑپہ آنا پڑا۔

حسنِ اتفاق یہی کہیے کہ وہاں کے صوبہ دار نواب عبدالمجید خان، نہایت خوش اخلاق اور علم دوست واقع ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے ولی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ان کی خوب قدر دانی و عزت افزائی کی۔ پھر انھیں شہر کڑپہ سے تقریباً دس میل دور دریائے "پنّا" کے پر فضا کنارے پر واقع قلعۂ سدھوٹ میں بطور ملازم مقرر کرتے ہوئے ان کے لئے قیام و طعام کا اعلیٰ انتظام کر دیا۔ تاکہ ان کے علمی و ادبی مشاغل کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔ یہ حسن نیت کی کرشمہ سازی تھی کہ تقریباً چار ہزار ابیات پر مشتمل ولی کی مثنوی "رتن پدم" کہ جس میں رتن سین اور پدماوت کا وہ قصہ جو ملک محمد جائسی (1049-900ھ) کی مشہور زمانہ شاہکار تصنیف "پدماوت"[1] سے ماخوذ ہے، نظم کیا گیا ہے، قیام سدھوٹ کی رہونِ منت ثابت ہوئی ہے

ولی نے مذکورہ تمام واقعات و حالات "رتن پدم" کے دیباچے میں من و عن بیان کئے ہیں۔ انھیں میں سے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

جراست خاں امیر اک نامور تھا!
سکونت گاہ اس کوں سات گڑھ تھا

---

[1] "پدماوت" فارسی رسم الخط میں تحریر کی گئی تھی، بعد کو ہندی والوں نے اسے دیوناگری لپی میں تبدیل کر دیا تھا۔

اتھا او اہل درد و نیک اعمال
رفاقت میں اتھا میں اس کے خوش حال
قضارا واں سوں ہو قسمت نے برخواست
سو آیا میں طرف کڑپے کے دھر خواست
نواب عبدالمجید ابنِ الحمید ایک
اتھا واں نامور صوبہ سعید ایک
سو اوبہر شجا پروانہ لکھ کر
بسلک نوکراں میں منسلک کر
تعین کر مجکو سدھوٹ کو روانہ

کیا وہ صاحبِ شیریں زمانہ
سو حسب الحکم میں سدھوٹ کو آیا
رنگا رنگ واں تماشے میں نے پایا

الغرض ولی نے "رتن پدم" میں تذکرۂ واقعات کے ضمن میں
مختلف مقامات پر اپنے تخلص کا بخوبی استعمال کیا ہے۔ مثلاً
ولی تیرے کرم کی ہے مجھے آس
نکر اس آس سو ہرگز تو نراس
ولی ہے یو سبب خالی بہانا
اسی کام ہے دینا دلانا

"رتن پدم" کے سنِ تصنیف کے سلسلے میں تمام تذکرہ نگاروں
نے سکوت ہی کو ترجیح دی ہے۔ اس تعلق سے راقم الحروف کی رائے

میں اتنی بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ 'رتن پدم' ۱۱۶۵ھ تا ۱۱۶۹ھ
کے درمیانی سالوں میں معرض وجود میں آئی تھی۔ یہ اس لئے کہ 'رتن پدم'
کی تمہید میں ولی ویلوری نے قلعہ سدھوٹ کے جس نواب عبدالحمید
کا ذکر کیا ہے "آندھرا پردیش گزیٹرس کڑپہ کے بموجب اس کا عہد حکومت
۱۷۵۳ء تا ۱۷۵۷ء مطابق ۱۱۶۵ تا ۱۱۶۹ ہے۔ ولی ویلوری کا شعر یہ ہے:

نواب عبدالمجید ابن عبدالحمید تک
اتھا واں نام درصوبہ سعید ایک

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ولی ویلوری کی ضخیم مثنوی
ان کی زندگی کی سب سے آخری مثنوی ہے نہ کہ سب سے پہلی مثنوی۔ جیسا کہ
جناب نصیر الدین ہاشمی کو مغالطہ ہوا، اور ان کا تتبع کرتے ہوئے دیگر تذکرہ
نگاروں نے 'رتن پدم' کو ولی ویلوری کا اولین کارنامہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر
جمیل جالبی نے 'رتن پدم کا سال تصنیف ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء قرار دیا ہے
جو مذکورہ حقائق کی روشنی میں غلط ہے۔ (ص ۱۰۱۹ تاریخ ادب اردو جلد دوم
حصہ سوم۔ از جمیل جالبی) ولی ویلوری کا ایک اور عظیم شاہکار روضۃ الشہداء ہے۔

۲۔ روضۃ الشہداء : اس میں واقعات کربلا نظم کئے گئے ہیں۔ یہ
دراصل مُلّا حسین واعظ الکاشفی کی فارسی کتاب کا کامیاب ترجمہ ہے۔ جناب نصیر الدین
ہاشمی لکھتے ہیں: "ہم نے یورپ میں دکھنی مخطوطات میں روضۃ الشہداء
کا فارسی سے مقابلہ بھی کیا۔ جس سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ولی
نے کامیاب ترجمہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعری میں بلند مرتبہ رکھتا تھا"
روضۃ الشہداء کے سن تصنیف کے متعلق محققین میں اختلاف

پایا جاتا ہے۔ جناب سید شمس اللہ قادری نے ۱۱۱۹ھ کو ترجیح دی ہے اور ثبوت میں اسی کتاب سے حسبِ ذیل شعر نقل کیا ہے:

کیا ہوں جب ختم یوں درد کا حال
اگیارہ سو پو تھا انیسواں سال

صاحبِ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ نے بھی یہی تاریخ قلمبند کی ہے۔ مگر ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور جناب نصیر الدین ہاشمی نے اس کی تصنیف کا سال ۱۱۳۷ھ قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے حضرت احسن مارہروی کے مرتب کردہ "کلیاتِ ولی" کے حوالے سے "روضتہ الشہداء" کی تاریخ تصنیف ۱۱۴۱ھ رقم کی ہے اور دلیل کے طور پر درج ذیل اشعار پیش کئے ہیں۔

ہوا ہے ختم جب یوں درد کا حال
اگیارہ سو پہ تھا اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یوں تاریخ معقول
ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

۱۱۴۱ھ

راقم الحروف کی رائے میں روضتہ الشہداء کی تاریخ تصنیف ۱۱۳۷ھ صحیح ہے۔ کیوں کہ احقر نے کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں جو نسخہ دیکھا ہے اس کے آخر میں ترقیمہ کے طور پر درجِ ذیل عبارت موجود ہے "۱۱۳۷ھ کتاب دکھنی روضتہ الشہداء در بیان امام حسینؑ تصنیف میر ولی فیاض صاحب

سجادہ منوچہرہ کردہ اند واللہ اعلم" اور اس کی تاریخِ کتابت ۹، ذی الحجّہ ۱۱۳۷ھ فصلی ہے۔

بہرکیف یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ تاریخِ کتابت اور تاریخِ تصنیف دونوں ایک ہی ہو سکتے ہیں مگر کسی بھی صورت میں تاریخ کتابت کے بعد اسی کتاب کی تصنیف ہوئی ہو یہ امر محال ہے۔ البتہ یہ بات ممکن ہوسکتی ہے کہ روضۃ الشہداء پہلی بار ۱۱۳۷ء میں لکھی گئی ہو۔ پھر نظرِ ثانی کے بعد حذف و اضافے کے ساتھ ۱۱۴۱ھ میں دوبارہ لکھی گئی ہو۔ اور مذکورہ تاریخی شعر بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہو۔ اس طرح تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی کا شکار ہونا پڑا۔ اب رہی روضۃ الشہداء کے ۱۱۱۹ھ میں تصنیف ہونے کی بات ممکن ہے کہ سینتیس[۳۷] کو ناقل نے غلطی سے انیس[۱۹] سمجھ کر لکھ دیا ہو۔ یہ اس لئے کہ دارالعلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور کے کتب خانے میں موجود نسخے میں شعر اس طرح درج ہے:

کیا ہوں ختم جب یو درد کا حال
اگیارہ پہ تھا سی تیسواں سال

الغرض مذکورہ دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ولی کی معرکت آراء مثنوی کی تاریخ تصنیف ۱۱۳۷ھ ہے۔

- روضۃ الشہداء دس مجالس پر مشتمل ہے اسی لئے اس کو "دہ مجالس" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

مجلس اوّل :۔ ذکر وفات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

مجلس دوّم :۔ ذکر وفات سیدۃ النساء جناب فاطمۃ الزھرا رضی اللہ عنہا

مجلس سوّم :۔ ذکر وفات حضرت امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب کرم اللہ وجہٗ۔

مجلس چہارم :- ذکر خلافت حضرت امام حسن علیہ السلام
مجلس پنجم :- ذکر تولّد حضرت امام حسن علیہ السلام
مجلس ششم :- ذکر شہادت فرزندانِ حضرت مسلم رضؓ
مجلس ہفتم :- روانگی حضرت امام حسین از مکہ سوئے دشت کربلا
مجلس ہشتم :- ذکر شہادت محبان و برادرانِ جناب سید الشہداء علیہ السلام
مجلس نہم :- ذکر شہادتِ جناب سید الشہداء امام حسین علیہ السلام
مجلس دہم :- بقیہ حالاتِ شہادت جناب سید الشہداء علیہ السلام

یہ کتاب ۱۲۹۱ھ اور ۱۲۹۶ھ میں بمبئی میں دو مرتبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ ولی کی اس مشہور اور ہر دلعزیز مثنوی کے تعلق سے حضرت علامہ باقر آگاہ ویلوری رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۵۸ھ - ۱۲۲۰ھ) کی تنقید لائق قدر بھی ہے اور قابلِ غور و فکر بھی۔ علامہ آگاہ رقم طراز ہیں:

"بعضے علماء اس مناقبِ اشرف کو فارسی کتابوں میں سیر کے درج کئے ہیں۔ لیکن کوئی کتاب مستقل اس بیان میں اب تک دیکھنے میں نہیں آئی پس تصنیف ہونا اس کا ہندی زبان میں معلوم مگر یہ کہ ولی ویلوری و شیدا حیدرآبادی (یہاں شیدا سے مراد میر نوازش علی خان بہادر ہیں جو نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے میر ساماں تھے، جن کی کتاب "روضۃ الاظہار" ۱۱۷۳ھ میں لکھی گئی۔ بقول افسر امروہوی 'قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیدا نے دکنی ویلوری کی روضۃ الشہداء کو نظر میں رکھا ہے اور اس کے مقابلے کی سعی کی ہے 'روضۃ الاظہار' اس کا نام بھی 'روضۃ الشہداء' کا جواب ہے' قومی زبان کراچی اپریل ۱۹۶۴ء، صـ۴۵ بعنوان گنجِ گراں مایہ)

دکھنی زبان میں دو نسخے منظوم لکھے، نام ان کا "روضۃ الشہداء" اور "روضۃ الاطہار"
مناقب عترت اخیار کے ان دونوں میں بہت کم ہیں۔ بلکہ نہیں ہیں۔ وفیات وشہادت
کی کچھ تفصیل کئے اور اکثر بیان ان دونوں کا غلط و بے اصل ہے جیسا کہ انتقام چاہنا
عکاشہ رض کا حضرت سے صلی اللہ علیہ وسلم اور اس تقریب سے بروقت مہر نبوت مشرف ہونا۔ یہ
روایت موضوع ہے۔ اسے بھائی عکاشہ بن حصین اسدی رضی اللہ عنہ سابقان مہاجرین سے
ہے۔ اور ہمیشہ جلیس وانیس اس جنابِ اقدس کا ہے۔ ایسا صحابی خاص مدت تیئیس برس میں
سال میں مہرِ نبوت کو نہ دیکھا ہونا اور خواہش اس کی دیکھنے کی اس بے ادبی سے کرنا
از روئے قیاس کتنی غلط ہے۔ اس طرح اور مواضع میں بھی بہت بے اصل باتیں لکھتے ہیں
اور کئے محل میں اپنے مذہب پر عمل کئے ہیں۔"

(علامہ باقر آگاہ کے اس آخری جملے سے باور کیا جاسکتا ہے کہ ولی شیعی
مذہب کے پیرو تھے، نہ کہ سنی۔ جیسا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب نے دعویٰ کیا تھا
مگر آپ کی دیگر تصانیف کے مدنظر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آپ غالی شیعی
ہرگز نہیں تھے بلکہ آپ کے مزاج میں وسعت تھی۔

حضرت باقر آگاہ کی معروضی تنقید سے قطع نظر ولی کے محض شاعرانہ
قد وخال کا مطالعہ کیا جائے تو یقیناً آپ اس دور کے ایک قلم آور اور ممتاز
شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوں گے۔ جناب نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔ "ولی
کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کی مثنویوں کے اشعار
کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے ان کی تصانیف میں مذہبی رنگ زیادہ ہے
لیکن پھر بھی شاعرانہ خصوصیات اور نکات سے خالی نہیں ہے۔"

بقول ڈاکٹر سید جعفر صاحبہ / ولی ویلوری کی 'روضۃ الشہداء' سے

جنوبی ہند میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ روضۃ الشہداء میں رزمیہ مناظر کی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ اور وؔلی ویلوری کو جذبات غم ادا کرنے میں خاص کمال حاصل ہے۔ "مرثیت" اور "بین" ان کے مراثی کے خاص وصف ہیں اور انھیں خصوصیات نے وؔلی ویلوری کو ایک کامیاب مرثیہ نگار بنا دیا ہے۔"

الغرض روضۃ الشہداء کی انھیں خصوصیات کی بناء پر تذکرۂ شعرائے دکن اور "گل رعنا" کے مرتبین نے اس مرثیے کو وؔلی اورنگ آبادی کی تصنیف قرار دینے کی غلطی کی ہے اور رام بابو سکسینہ نے بھی اس کا اعادہ کیا ہے حالاں کہ روضۃ الشہداء ولی ویلوری کا شاہکار مرثیہ ہے۔

وؔلی ویلوری کی دیگر تصانیف میں "روضۃ الانوار" بھی ہے جو سیرتِ طیّبہ کا منظوم مرقع ہے جس کی تصنیف ۱۱۵۹ھ میں ہوئی ہے۔ بقول ڈاکٹر غلام علی خان اس مثنوی کے جملہ اشعار دو ہزار ۲۲۴۰ دو سو چالیس ہیں۔

۴۔ **روضۃ العقبیٰ** : یہ مثنوی احوالِ آخرت کے تعلق سے نظم کی گئی ہے اور ۱۱۶۲ھ میں معرضِ وجود میں آئی جس کے کل اشعار بقولِ ڈاکٹر مصطفےٰ خان ایک ہزار تین سو پچاس ہیں۔

۵۔ دعائے فاطمہؓ : یہ مثنوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے دعاؤں پر مشتمل ہے، وؔلی کے کلام کا جوہر سلاست وسادگی اور جذبہ وشیفتگی ہے جو قاری کی توجہ کا مرکز بھی ہے اور شاعری کی کشش کا محور بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کروں نامے کو بسم اللہ سوں آغاز

اچھیوں تا میں فصاحت میں سرفراز

ولیکن شاہ کا اودید بہ دیک
صلابت ہور عالی مرتبہ دیک

اُنے بھی ہاتھ ڈالیا تیغ پرواں
ولے ہاشم نے کچھ فرصت دیاتاں

ننھی نھی فاطمہ سب دختراں میں
واَچھیاں چاند جیوں سب اختراں میں

شکم میں ماں کے تھا جو اُن کو آرام
رکھے حضرت نے ان کو فاطمہ نام
(غالباً اس شعر میں وجہی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ عربی میں فَطَمَ بچہ کے دودھ چھڑانے کو کہتے ہیں۔ ماں اپنے بچے کا دودھ اس وقت چھڑاتی ہے جب کہ بچہ توانا اور صحت مند ہو۔ اس طرح 'فاطمہ' کا معنیٔ مجازی 'آرام پانے والی' کہا جاسکتا ہے)
پکڑ قوت ستی ایسا مروڑے!
جو گردن کی رگاں ہور ہاڑ توڑے

یکس پر یک چلائے تول نیزے
ہوئے دو لوں میں گولا گول نیزے — (روضۃ الشہداء)

کیا تالیف یوں میں مختصر قال
ترے محبوب پیغمبر کا احوال!!

وعید و وعدہ لایا یوں جمع کر
وعیداں موڑ دیں وعدہ پو دل دھر

مذکورہ مثنویوں کے علاوہ ولی نے ایک مناجات بھی لکھی ہے۔ جس کے پچیس بند ہیں ایک بند بطور نمونہ ملاحظہ ہو :

یا الٰہی از طفیل انبیاء ہور اولیاء
غوث اور اقطاب ہیں جتنے جہاں کے صفیا

آبرو رکھ دو جہاں میں ہے ولی کی التجا
ہے او بندہ کمترین مجھ حال پر احساں کرو

مندرجۂ بالا اشعار سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ولی کی زبان صاف و شستہ تھی۔ تعقید و تکلف سے یکسر خالی آپ کی خلاقیت نے ہزاروں اشعار کو وجود بخشا، قدرت کلام کا یہ عالم کہ شاعری پیشہ نہ ہونے کے باوجود طویل و ضخیم مثنویاں آپ نے اپنے بعد بطور یادگار چھوڑیں۔

بہر حال قلعہ سدھوٹ میں مدت دراز قیام کرنے کے بعد ولی دوبارہ ویلور لوٹ آئے۔ ویلور سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر واقع شہر آرنی کے قریب قصبہ چیت پیت (چیٹ پٹ) میں آپ کی جاگیر تھی۔ کڑپہ سے مراجعت کے بعد آپ نے اپنی اسی جاگیر میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ بعد کے حالات سے پتہ

چلتا ہے کہ ولی نے اپنی زندگی کے آخری ایام شہر آرکاٹ میں بتائے تھے اور وہیں آپ کا انتقال بھی ہوا۔ مزار محلہ اسد پورا میں واقع ہے یہ محلہ درحقیقت امیر اسد اللہ خاں (المتوفی ۱۱۴۹ھ م ۱۷۳۷ء) کے نام سے موسوم تھا۔ جو نواب سعادت اللہ خاں والیِ آرکاٹ (المتوفی ۱۱۴۴ھ م ۱۷۳۲ء) اور ان کے فرزندِ ارجمند نواب دوست علی خان کے دورِ حکومت میں آرکاٹ کی وزارت پر فائز رہے۔ امیر اسد اللہ خاں کا مزار مشہور بزرگ ولیِ کامل حضرت ٹیپو اولیاء کے روضہ کے قریب سڑک کی دوسری جانب ایک چہار دیواری کے بیچوں بیچ واقع ہے اسی احاطے میں مزار کی سیدھی سمت میں مشہور زمانہ شاعر لطیف آرکاٹی کی قبر موجود ہے اس احاطے کے باہر شیعہ حضرات کی ایک وسیع و عریض مسجد ویران پڑی ہوئی ہے۔ اس مسجد کے کشادہ صحن کے سرے پر جنوب کی سمت میں ولی ویلوری کا مزار آج سے چند سال پہلے تک مقامِ عبرت بنا ہوا تھا مگر اب وہ قبر مسطح کر دی گئی ہے اور اس زمین پر ایک غیر مسلم خاندان آباد ہے۔ اور اس بربادی پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ولی کی وفات کا سن ۱۱۵۰ھ رقم کیا ہے۔ جو ولی کی مثنوی روضۃ العقبیٰ سالِ تصنیف ۱۱۶۲ھ کے مدِ نظر صحیح نہیں ہے بہر حال بقولِ جناب نصیر الدین ہاشمی ۱۱۶۲ھ تک ولی کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ ولی ویلوری کے ایک شاگرد و مرید صوفی اعظم کی مثنوی "عاشور مالا" سنہ تصنیف تقریباً ۱۱۵۰ھ کا پتہ چلتا ہے۔ جس کی ابتدا شاعر نے خود کو میر فیاض علی مصنف "روضۃ الشہداء" کے شاگرد و مرید کی حیثیت سے پیش کیا۔ چنانچہ اعظم کہتے ہیں:۔

ولی جو فیاض مرشد بحق

ادا کرتے بہ انصاف حقوق بحق

اکتسابِ نظر

وہ فیاض عالی قدم کے طفیل
وہ لو جگ میں روشن کر حق بافضل

اس مقالے کی تیاری میں مندرجۂ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے -

۱۔ زور محی الدین قادری ، دکنی ادب کی تاریخ
۲۔ شمس اللہ قادری حکیم سید ، اردوئے قدیم
۳۔ نصیر الدین ہاشمی ، دکن میں اردو و یورپ میں دکنی مخطوطات
۴۔ باقر آگاہ ویلوری ، ریاض الجنان
۵۔ افضل الدین اقبال ، ڈاکٹر ، مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما
۶۔ رام بابو سکسینہ ، تاریخ ادب اردو
۷۔ گوپی چند نارنگ ، ڈاکٹر ، اردو مثنویاں
۸۔ سیدہ جعفر ڈاکٹر ، رہنمائے اسباق
۹۔ غلام مصطفیٰ خان ، ڈاکٹر ، علمی نقوش
10. SARVA SANKARA, Dt. (edt) Andrapradesh District Gazittier, Cuddapah,
11.

یوسف زلیخا کا ایک نو دریافت مخطوطہ

خالقِ کائنات اپنی مخلوقات پر کبھی ظلم و زیادتی روا نہیں رکھتا ہے، چنانچہ خدائے تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا کہ " ان اللّٰہ لیس بظلام للعبید " (بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں ہیں) اور وہ ظلم کرتا بھی کیسے؟ جب کہ جملہ مخلوقات اسی کے مظاہر ہیں کوئی بھی ذات اپنے مظاہر پر ظلم و زیادتی نہیں کرتی ہے۔

باوجود اس حقیقت کے، ہم دیکھتے ہیں دنیا میں بے شمار ایسے معذور جنم لیتے ہیں جنھیں دیکھ کر بے ساختہ قلب میں جذبہ ترحم پیدا ہوتا ہے اور ان کی حالت زار پر ہم بے حد افسوس کا اظہار بھی کرنے لگتے ہیں۔ خدائے برتر کی مصلحت و حکمت وہی جانے مگر ذرا ہم غور و فکر کریں اور بہ نظر غائر دیکھیں تو یہ حقیقت آشکارا ہو گی کہ جب بھی خدائے تعالیٰ ایک طرف سے کسی کی کوئی ایک چیز چھین لیتے ہیں تو دوسری طرف سے اس کا نعم البدل بھی عطا فرما دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ اس

کا احساس بسا اوقات ناظر کو تو کجا مبتلا یہ کو بھی ہو نہیں پاتا ہے۔ یہی قانونِ قدرت عموماً حواسِ خمسۂ ظاہرہ پر لاگو ہوتا ہے خصوصاً چشمانِ روشن پر کہ جب کوئی شخص شکم مادر میں بینائی سے محروم رکھا جاتا ہے تو اس کے دیگر حواس غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو مادر زاد نابینا ہوگا، اس کی چھٹی حس نہ صرف بیدار ہوگی بلکہ اس قدر تیز تر ہو جائیگی جسے دیکھ کر اہلِ علم حیرت زدہ رہ جاتے ہیں اور عوام اس کو کرشمہ سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

سچ پوچھیں تو صد فی صد ایسی ہی ایک شخصیت عہدِ سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ / 1656ء تا ۱۰۸۳ھ / 1672ء) کے باکمال و بے مثال شاعر کی تھی جن کا نام تای سید میراں میاں خاں اور تخلص ہاشمی بیجاپوری تھا۔ آپ مادر زاد نابینا ہونے کے باوجود کسی کی صرف آواز سن کر اس کے خدوخال، رنگ روپ، چال ڈھال یہاں تک کہ لباس کی تراش خراش تک بتا دیتے تھے۔ ہاشمی بیجاپوری نے اپنے مادر زاد نابینا ہونے کا ذکر متعدد اشعار میں کیا ہے ؎

دو نوں انکھیاں معذور ہوں، تس پر پڑھیا نیں یک حرف
کیوں شعر بولو بولتا، پختہ سو پاکیزہ ہنوار

(قصیدۂ ذوالفقار علی خاں از ہاشمی ص ۱۲۳ دکنی شاعری تحقیق و تنقید، ڈاکٹر محمد علی اثر)

تعجب یہی ہووے گا ٹھار ٹھار انکھیا نے پرویا ہے موتیاں کا ہار
تعجب بھی ہووے گا یوں چار دہر انکھیاں نہی کیا کیوں سو دریا کو تیر

(ماخوذ از احسن القصہ ہاشمی)

پیدائشی اندھے پن کی وجہ سے ہاشمی کی چھٹی حس بہت تیز اور بے حد توانا ہو گئی تھی۔ اسی چھٹی حس کو سید نصرت مہدی ید اللّٰہی مصنف " اردو ادب

میں مہدیوں کا حصّہ" نے سہواً قیافہ شناسی سے تعبیر کیا ہے اور آوازسن کر لباس کا رنگ بتلانے کا واقعہ "سوانح بندگی میاں سید زین العابدین از عبد الکریم" سے نقل کیا ہے۔ "اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں" کے مؤلف ڈاکٹر محمد باقر نے "بساتین السلاطین" (مخطوطۂ برٹش میوزیم ورق ۹۲) کے حوالہ سے خاتون خانہ کی قیل و قال سن کر ان کے خد و خال، حسن و جمال اور لباس و مال کو تک تفصیل سے بیان کرنے کا واقعہ نقل کیا ہے۔

ہاشمی بیجاپوری نے شاہ ہاشم مہدی (المتوفی ۱۰۸۰ھ ۱۶۶۹ء) کے مرید و مجاز ہونے کی مناسبت سے اپنا تخلص ہاشمی رکھ لیا تھا۔ بقول ڈاکٹر محمد علی اثر مؤلفِ دکنی کی تین مثنویاں مثنوی "یوسف زلیخا" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی نے یہ مثنوی اپنے پیر و مرشد کی فرمائش پر لکھی تھی۔"

ہاشمی بیجاپوری نے غزل قصیدہ، مثنوی وغیرہ ہر ایک صنف سخن میں خوب جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے جیسا کہ انھوں نے خود ہی کہا ہے کہ ؎

غزلاں، قصیدے، مثنویاں ہے جیو میں تجہ بولنا
دھرپٹ خیالاں تجہ اپر آتا مجھے کانے ہوس
میٹھی زبان سو میٹھیاں غزلاں ستی مٹھی ہو
میٹھی دی ہاشمی کوں نابات کل فتن نے

(ماخوذ از غزلیات ہاشمی)

ہاشمی بیجاپوری کا تعلق فرقۂ مہدویہ سے تھا، جس کا اقرار آپ نے متعدد مقامات پر کیا ہے ؎

ہے یو صفت مجھ پیر، کا، ہے شاہ ہاشم ناؤں اس
تھا نقش جس کے دل منے مہدی کری رفتار کا
یو صفت ہے مہدیہ کی، معبود رب کا ہیچ او
تصدیق جس کی فرض اور ہے وہ حسن انکار کا
(یوسف زلیخا)

نبی اور مہدی کو ایکیچ پچھان — یو یک ذات دو کہہ یو آیا ہے جان
جو کوئی شخص لایا نبی پر ایمان — رہا اوچ مؤمن ہو مہدی کومان
(مثنوی یوسف زلیخا)

مقام حیرت ہے کہ ہاشمی بیجاپوری ایک راسخ العقیدہ مہدوی ہونے کے باوجود اپنے قصیدہ "سرس ہائے ہاشمی" میں روحِ مہدویت کے خلاف عالمگیر کے معروف صوبہ دار نواب ذوالفقار علی خاں نصرت جنگ (۱۶۹۲ تا ۱۷۰۹ء) کی نہ صرف مبالغانہ تعریف کی بلکہ مذکورہ نواب صاحب کی خدمت میں پہونچکر آپ کے آگے دست سوال دراز کیا ؎

ہاتی روپے کے ہووے سوں کئی گاوں لکھ کر لیوں گا
آیا ہوں برہان پور تے یوں دل میں اپنے کر قرار

یک گاوں ہاشمی کو چن کر سرس سا دینا
مشغول ہو دعا میں جو دھر رہے کنارا (قصیدۂ سرس ہائے ہاشمی)

ہاشمی بیجاپوری نے اپنی کور چشمی و معذوری کے باوجود جنوب و شمال کے دور دراز علاقوں کی خوب سیاحی کی تھی، جس کی وجہ سے آپ کی شاعری

میں تجربات کی صد رنگی عقل و خرد کو محوِ حیرت کرتی دکھائی دیتی ہے، آپ اپنی سیاحی کا ذکر مختلف شعروں میں کیا ہے ؎

بجاپور، گولکنڈہ یا کنول، راچور، ادھونی
رکھی اکثر بھنور میں یا سگر میں کوئی پھبلی

دلو اسی می پینچی رہی، کڑپہ کو آئے ہونگے
خوش ہو تو ہاشمی نے گھاٹ چڑھے سدام کی

نہ ملتی ہاشمی دیکھو! تمہیں بھی مل کے رہتے ہیں
دکھن، کشمیر اور پورب، دلی، گجرات میں دیکھو

(دیوان ہاشمی مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل ص۲۱۴)

ہاشمی بیجاپوری کا سالِ انتقال ۱۱۰۹ھ ہے بقول جناب امر صدیقی امروہوی شمس اللہ قادری نے "اعراس بزرگان" کے حوالے سے اس کا سنہ وفات ۱۱۰۹ھ قرار دیا ہے..... قادری صاحب کا بیان کردہ سنہ وفات بظاہر قابلِ تسلیم ہے" ــ اور "یورپ میں دکنی مخطوطات کے مؤلف جناب نصیر الدین ہاشمی نے "مرثیہ ہاشمی" کے تحت اس سنہ کا اقرار کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ "غرض کہ ہاشمی کی قابلیت مسلمہ تھی، ۱۱۰۹ھ میں اس نے انتقال کیا ہے ــ

ہاشمی کے دستیاب کلام میں مثنوی "احسن القصص" کی خاص اہمیت ہے یہ مثنوی سنہ ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۸۷ء میں معرضِ وجود میں لائی گئی جیسا کہ خود ہی کہا ہے ؎

ہزار برس پر تھے جو نو دیہ نو مرتب کیا میں یو قصّے کوں تو

اس مثنوی کے جملہ اشعار کی تعداد پانچ ہزار ایک سو بیاسی (۵۱۸۲) ہے، اس

دعویٰ کا شاہد بھی ہاشمی کا درجِ ذیل شعر ہے ؂

پوچھے کوئی بیتوں کا، کہہ تو شمار | کہ ایک سو بیاسی اہے پنج ہزار

ہاشمی نے اپنی اس مثنوی میں قصۂ حضرت یوسفؑ و زلیخا کے ضمن میں دکنی تہذیب و ثقافت کو بڑے ہی خلاقانہ طور پر پیش کیا ہے۔ یہ مثنوی آپ کی قادرالکلامی، سلاست و روانی اور تخیل کی بلند پروازی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ آپ کو دکنی شاعری پر بجا فخر تھا، اسی لئے تو آپ نے کہا

تجھے چاکری کیا تو اپنیچ بول | ترا شعر دکنی ہے دکنیچ بول

اس مثنوی احسن القصہ کا دوسرا نام بلکہ معروف نام مثنوی "یوسف زلیخا" ہے نصیرالدین ہاشمی کو اس بات میں شبہ تھا کہ مثنوی "یوسف زلیخا" اور "احسن القصہ" ایک ہی مثنوی کے دو نام ہیں۔ حالاں کہ بعد تحقیق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ مثنوی "یوسف زلیخا" کا حقیقی نام "احسن القصہ" ہے اس حقیقت کی طرف شاعر نے خود بھی اشارہ کیا ہے ؂

کہا احسن القصہ جسکوں خدا | کتا ہوں کہ میں اس کتاب ابتدا

رکھا احسن القصہ رب جسکا نام | تجھے کھول کر میں اد بولیا تمام

اگر توں بہی اپنا منگے رکھنے نام | زلیخا کے قصے کوں کر توں تمام

ڈاکٹر محمد باقر مؤلفِ "اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں" نے حیرت سے یہ بات کہی کہ "نہ جانے کیوں ہاشمی نے کتاب کا نام "احسن القصص" کی بجائے احسن القصہ رکھا ہے"۔ اس میں شک نہیں ہے کہ قرآن شریف قصۂ یوسف زلیخا کو "احسن القصص" کے لقب سے یاد کرتا ہے، مگر چوں کہ ہاشمی نے یہ مثنوی "بحر متقارب" میں کہی ہے جس کا وزن "فعولن فعولن

فعولن فعول" ہے۔ اس وزن میں لفظ "احسن القصہ" بٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی صورت لفظ "احسن القصص" بٹھایا نہیں جا سکتا، اسی ضرورت شعری کی بناء پر ہاشمی نے اپنی مثنوی کا نام احسن القصص کی بجائے "احسن القصہ" رکھا ہے ۔۔۔

بہرحال اس معرکہ آراء مثنوی کے تاحال معلوم شدہ نسخے جملہ تیرہ[13] ہیں جن میں سے جناب افسر صدیقی امروہوی نے مخطوطات انجمن ترقی اردو (پاکستان) جلد پنجم میں پانچ[5] نسخوں کا غلط ذکر کیا ہے، ڈاکٹر محمد باقر نے مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع شدہ اپنی تالیف "اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں" میں صرف چار[4] کا تذکرہ فرمایا ہے اور جناب نصیر الدین ہاشمی کی مرتب کردہ "اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست کتب خانۂ نواب سالار جنگ مرحوم میں دو[2] نسخوں اور فہرست کتب خانۂ آصفیہ میں ایک[1] نسخہ کی نشاندہی کی گئی ہے اب رہا تیرہواں[13] نسخہ تو یہ نادر و نایاب مخطوطہ حال ہی میں راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے جو مشائخین قصبۂ سدھوٹ کے ذاتی کتب خانہ کی زینت بڑھا رہا ہے اور تاحال دستیاب حقائق کی روشنی میں نسخۂ سدھوٹ ہی سب سے قدیم اور سب سے بہتر نسخہ ہے۔

الغرض تمام نسخوں کی ممکنہ تفصیلات اس طرح ہیں : ۔۔۔

مخزونۂ انجمن ترقی اردو (پاکستان)

نسخۂ اوّل :۔

نام کتاب : مثنوی "یوسف زلیخا" . نام مصنف : سید میراں ہاشمی

کتاب کا سائز "۸ × ۴ ۱/۲" کل صفحات : ۳۸۹

سطور :- ۱۶ سن کتابت :- ۱۱۷۴ھ
کل ابیات :- ۱۸۲ خط :- نستعلیق
جلد :- مجلّد

اغاز :- اول کتا ہوں عشق سوں میں حمد سرجنہار کا
بعد از بیاں کیوں سربسر اس عشق کے پستار کا
دیکھ عشق ہر اک شئی منے میں تے لکھن نامہ کیا
کیں عشق بازاں بلکہ یوں لاوک ہے یک تار کا

ثنا حمد اسکوں سزاوار ہے بسگل عشق کا جس سوں پستار ہے
اول عشق کا کر کے دل جک قرار براہیم پیدا کیا کردگار

اختتام :-

مرا شعر جیو رکھ سنے گا جتے مرے حق پہ ایمان منگتا انے
کہ الحمد للہ یو قصہ تمام ہوا سو محمد پہ نت ہے سلام

ترقیمہ :- تمت الکتاب بعون ملک وہاب بتاریخ بیست و پنجم محرم الحرام ۱۱۷۴ھ

نسخہ دوم :- ۳ / ۴۶۶

سائز :- ۸ × ۵½ صفحات :- ۳۰۴
سطور :- ۱۵ سنہ کتابت :- ۱۲۸۷ھ
جملہ ابیات :- ۲۳۶۲ (ناقص) خط :- مثلث

کیفیت :- صفحات کو سرخ و سیاہ جدولوں سے آراستہ کیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں یہ عبارت تحریر ہے۔ "یوسف زلیخا" مالک حضرت باچھا میاں اور "ترکیب روزہ محرم" روضہ میاں و فقیر میاں صاحب باتفاق یکدیگر از محرم

سنہ ۱۲۴۷ھ شروع نمودہ اند۔

نسخۂ سوم :- پ ۳/۴۶۷

سائز :- "۷ ۱/۲ × ۴ ۳/۴" صفحات :- ص ۴۰۵

سطور :- س ۱۳ سنہ تصنیف :- سنہ ۱۰۹۹ھ

سنہ کتابت :- سنہ ۱۱۹۳ھ خط :- شکستہ نستعلیق

کتاب :- مکمل ترقیمہ : تمت الکتاب بعون الملک الوہاب بتاریخ ہفدہم شہر رجب المرجب سنہ ۱۱۹۳ھ باتصرام رسید۔:

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید

ہر کہ خواہد دعا طمع دارم زانکہ من بندۂ گنہگارم

نسخۂ چہارم :- پ ۳/۴۶۸

سائز :- ۸ ۱/۲ × ۶ ۱/۲ صفحات :- ص ۴۰۲

سطور :- ۱۳ خط :- نستعلیق با سرخ جدول

سنہ کتابت :- سنہ ۱۲۴۵ھ کیفیت :- کتابت کے اغلاط بہت ہیں

ترقیمہ :- محررہ فی التاریخ دویم ماہ ذی قعدہ در مقام نیگندہ در سنہ ۱۲۴۵ھ باتمام رسید اگر کسے دعوی کند باطل است، ماہ شعبان بتاریخ بیست و دوم بروز جمعہ سنہ ۱۲۵۱ھ۔

نسخۂ پنجم :- پ ۳/۴۹۹

سائز :- "۷ ۳/۴ × ۴ ۱/۲" صفحات :- ص ۳۶۳

سطور :- ۱۵ سنہ تصنیف :- سنہ ۱۰۹۹ھ

سنہ کتابت :۔ تقریباً دو سو برس قبل خط :۔ نستعلیق، شکستہ

اوراق :۔ کرم خوردہ

ڈاکٹر محمد باقر کے بیان کردہ نسخے :۔

نسخۂ اوّل :۔ "برٹش میوزیم" میں موجود ہے۔ سائز "۱۱×۱۰

اوراق :۔ ص ۲۳۶ سطور ۱۱

تاریخ کتابت :۔ ۱۱، شوال ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء۔

کاتب کا نام : محی الدین خاں سکتہ نہاور۔

نسخۂ دوّم :۔ جرمن اورینٹل سوسائٹی کی ملکیت۔ بحوالۂ فہرست کتب خانۂ جرمن اورینٹل سوسائٹی جلد دوم ص ۶۶ ۔ ڈاکٹر موصوف نے اس نسخے کی تاریخ کتابت وغیرہ تفصیلات درج نہیں کئے ہیں۔

نسخۂ سوّم :۔ مخزونۂ حکیم شمس اللہ قادری مرحوم ۔ ڈاکٹر موصوف نے اس نسخے کی تفصیل بھی نہیں بتائی ہے۔ اگر نسخۂ جرمنی اور نسخۂ قادری میں کوئی خاص بات ہوتی تو ضرور اس کا تذکرہ کیا جاتا۔

نسخۂ چہارم :۔ مخزونۂ کتب خانۂ مخطوطات مشرقیہ مدراس۔ اس نسخے میں بھی کوئی ایسی اہم خصوصیت جو دیگر نسخوں سے اس کو ممتاز کرنے والی ہو۔ نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر محمد باقر نے اس نسخہ کا صرف پتہ تحریر کرنے پر اکتفا کرلیا ہے۔ چوں کہ راقم الحروف نے خود اس نسخے کو مدراس کے مذکورہ کتب خانے میں دیکھا ہے اس لئے اس کی تفصیل یہاں رقم کر رہا ہے۔

نام کتاب :۔ مثنوی یوسف زلیخا مصنف :۔ ہاشمی

کل صفحات :- ۳۳۸ ص   سطور :- ۱۵ ص

خط :- عربی رسم الخط۔   کیفیت : کتاب مجلد اور مکمل

سن کتابت :- ۱۱۹۳ھ

ترقیمہ :- کاتب الحروف عاصی سید کریم بتاریخ دوازدھم ، شہر شعبان سنہ یک ہزار ویک صد و نود و سہ سال ہجرۃ النبوی ، در بندر چناپٹن روز چہارشنبہ بوقت دو پہر و چار گھڑی متصل مکان عیدگاہ باتمام رسید۔

کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کے نسخے :-

نسخۂ اوّل :- قصۂ "یوسف زلیخا" (۶۴۲ ص) نمبر (۵۳)

سائز :- (۱۰×۶) صفحہ (۳۷۳) سم

سطر :- (۱۵) خط : نستعلیق ،

کاغذ :- دیسی   مصنف : ہاشمی بیجاپوری

کیفیت :- یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اسی لئے سال کتابت بھی معلوم نہ ہو سکی

نسخۂ دوّم :- قصۂ "یوسف زلیخا" (۶۴۳) نمبر (۲۲۴ ب / میوزیم)

سائز :- (۹½ × ۵½) صفحہ : (۴۶۱)

سطر :- ۱۳ ص   خط : نستعلیق

کاغذ :- دیسی   مطلا سرورق ، مطلا جدول

اختتام :-

مرا شعر جس پو رکھ سینکا جیتی   مرے حق پہ ایماں منگے گا او نی
کہ الحمد للہ یو قصہ تمام   اہو سو محمدؐ پہ ہے نت اسلام

دوشنبہ کا تھا روز آخر ظہر، محرم کا تھا ساتویں سو جنور،

اس کتاب میں (۲۸) تصاویر دکن اسکول کی ہیں (۹) بعض پورے صفحے پر، بعض نصف اور ربع پر ہیں۔

مخزونہ کتب خانۂ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری) حیدر آباد

نسخۂ واحد: — کتاب "یوسف زلیخا" (۱۹۳) نمبر مثنوی (۲۶۷ ے)

سائز :- ۹×۶ صفحہ :- (۴۸۶)

سطر :- ۱۱ ے خط :- شکستہ

مصنف :- سید میراں ہاشمی تاریخ تصنیف: ۱۰۹۹ھ

سنہ کتابت : ۱۱۶۹ھ

ترقیمہ :- تمت تمام شد کار من نظام شد، از کاتب الحروف شیر محمد ساکن قصبۂ ماہرار، برائے خواندن برخوردار حبیب خان نوشتہ شد ۱۱۶۹ھ

مخزونۂ کتب خانہ جناب سید احمد بادشاہ قادری، سدھوٹ ضلعہ کڈپہ

نسخۂ واحد:- کتاب مثنوی یوسف زلیخا، مصنف :- ہاشمی بیجاپوری

جملہ صفحات:- ۳۶۶ خط:- نستعلیق، جدول ملوّن

سنہ تصنیف :- ۱۰۹۹ھ سنہ کتابت :- ۱۱۶۶ھ

کتاب، مجلد و کامل

الکتاب نظر

ترقیمہ :- ایں کتاب برائے محل نواب سراج الدولہ شہامت جنگ بہادر نصرت فتح جنگ نوشتہ شد ۲۷ رمضان المبارک ۱۱۶۶ھ

کیفیت :- ترقیمہ کے بعد چند سطور چھوڑ کر یہ عبارت تحریر کی گئی ہے :-

نسخۂ مذکور در مدراس بقیمت مبلغ "یکھون" گرفتہ شد ـــ مالک ایں کتاب نور خاں سوبیدار یعنی برخوردار قلندر خاں صاحب ـــ

مثنوی "یوسف زلیخا" کے تمام نسخوں میں نسخۂ سدھوٹ دو وجہ سے بہت ہی اہمیت اور بے حد کشش کا باعث ہے۔ ایک تو یہ بات کہ یہ نسخہ دیگر تمام نسخوں کے مقابلہ میں سب سے قدیم ہے اور شاعر کے انتقال ۱۱۰۹ھ کے تقریباً ستاون ۵۷ سال بعد نقل کیا گیا ہے، جس سے بوجہ قرب زمانہ اس کی تاریخی اہمیت آشکارا ہوتی ہے۔ دوسرا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ نسخۂ سدھوٹ نواب سراج الدین شہامت جنگ محمد جانِ جہاں انورالدین خاں بہادر والیٔ آرکاٹ (المتوفی ۱۱۶۳ھ) کی دوسری بیوی محترمہ فخرالنساء صاحبہ یعنی والدۂ حضرت نواب والاجاہ سراج الدولہ (۱۷۱۷ء ـــ ۱۷۹۵ء) کی فرمائش پر کسی کاتب نے آپ کے شوہر نامدار کی شہادت ۱۶ شعبان ۱۱۶۳ھ کے تقریباً چار سال بعد آپ کی غالباً دلجمعی کے لئے نقل کیا تھا۔ چوں کہ یہ نسخہ ایک انتہائی اہم شخصیت (۷۰۱۰۶) کے لئے نقل کیا گیا تھا، اس لئے عین ممکن ہے کہ یہ بہت احتیاط سے نقل کیا گیا ہو اور اس میں اغلاط بھی دوسرے نسخوں کے مقابلے میں کم سے کم ہوں۔

ایک اور خصوصیت نسخۂ سدھوٹ کی یہ ہے کہ اس کو بعد میں کسی نورالدین نامی صوبہ دار نے ایک "ہن" یعنی طلائی سکہ جو تقریباً بارہ ۵ گرام کے مساوی ہوا کرتا تھا۔ دے کر حاصل کیا تھا، اس حقیقت سے اس نادر و نایاب نسخے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

راقم الحروف کی رسائی اس نایاب نسخے تک ناممکن ہوتی اگر مشفق محترم جناب سید احمد باشا عرف برکلی باشا، مینیجر تلسی بیڑی فیکٹری، کڑپہ کی رہنمائی حاصل نہ ہوئی ہوتی، اس طرح راقم اس نادر نسخے کے شرف دیدار سے مشرف نہ ہوا ہوتا جب تک کہ اس کے مالک جناب سید احمد باشاہ قادری معروف بہ صاحب، وظیفہ یاب پولیس کانسٹیبل، کڈپہ کا مخلصانہ تعاون میسر نہ ہوا ہوتا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

اس مقالے کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:—

۱۔ دکنی کی تین مثنویاں .... ڈاکٹر محمد علی اثر
۲۔ دکنی شاعری، تحقیق و تنقید .... " "
۳۔ اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں —— ڈاکٹر محمد باقر
۴۔ مخطوطات انجمن ترقی اردو جلد پنجم (پاکستان) —— افسر صدیقی امروہوی
۵۔ اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست (کتب خانۂ سالار جنگ میوزیم) نصیر الدین ہاشمی
۶۔ اردو کے مخطوطات (جلد اول) کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد۔ نصیر الدین ہاشمی
۷۔ یورپ میں دکنی مخطوطات —————— نصیر الدین ہاشمی
۸۔ اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ —————— سید نصرت مہدی ید اللہی
۹۔ تزک والاجاہی —————— برہان الدین ہانڈی
۱۰۔ فہرست مخطوطات علوم مشرقیہ مدراس
۱۱۔ نسخۂ مخزونہ سدھوٹ ضلع کڑپہ

مولانا ذوالفقار علی اختر کڑپوی
اور
ان کی مثنوی در مدح ٹیپو سلطان شہیدؒ

سلطنت خداداد کی قلمرو میں داخل ہونے سے قبل، شہر کڑپہ، نوابانِ 'سدھوٹ' کی آبادی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یہاں کے حکمران 'میانہ' قبیلے کے افغانی پٹھان تھے جن کا سلسلۂ نسب بقول محمود خاں بنگلوری جلیل القدر صحابی رسولؐ حضرت سیف اللہ خالد بن ولیدؓ سے ملتا ہے۔ (صحیفہ ٹیپو سلطان حصۂ دوم ص ۲۷۷)

نوابانِ کڑپہ نہ صرف جنگجو بہادر سپاہی تھے بلکہ انہیں شعر و ادب سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ چناں چہ کڑپہ کے مشہور و نامور حاکم خان بہادر نواب عبدالنبی خاں میانہ (دورِ حکومت ۱۱۲۲ھ تا ۱۱۵۸ھ) کے دربار میں دکنی کے قدآور شاعر محمد ابن رضا موجود تھے۔ جنھوں نے شیخ الاسلام شرف الدین محمد ابن سعید بوصیری قدس سرہٗ کی بے انتہا مقبول و بے حد مشہور نعتیہ تخلیق 'قصیدۂ بردہ' کا سب سے پہلے دکنی میں ترجمہ کیا تھا، جس کا ایک نسخہ کتب خانۂ سالار جنگ میں محفوظ ہے اور راقم الحروف کی نظر سے گزر چکا ہے۔

نواب عبد النبی خاں میانہ کے جانشین اور فرزندِ ارجمند نواب عبد الحمید خاں میانہ (وفات ۱۱۶۲ھ) کے درباری شاعر محمد حیدر معروف بہ ابنِ جعفر تھے۔ جنھوں نے عہدِ قطب شاہی کے نامور شاعر ابنِ نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' میں تین سَو شعر کا اضافہ کر کے اس داستان کو طویل کیا تھا جس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ (دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۳۷۳)

نواب عبد الحمید خاں میانہ کے لختِ جگر نواب عبد المجید خاں میانہ (دورِ حکومت ۱۱۶۵ھ تا ۱۱۶۹ھ) کے دربار سے مشہورِ زمانہ دکنی شاعر ولی ویلوری وابستہ تھے، ولی ویلوری نے یہیں اپنی معرکہ آرا مثنوی 'رتن پدم' تصنیف کی تھی۔ جس کا تفصیلی ذکر انہوں نے اس مثنوی کی تمہید میں کیا ہے۔

(اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری)

بہرحال سرزمینِ کڑپہ صدیوں سے شعراء و ادبا اور اہلِ دل صوفیہ کی ماویٰ و ملجیٰ بنی رہی، آج بھی یہاں کے ماحول میں شعر و ادب کا ستھرا ذوق موجود ہے، یہاں کے اہل قلم اپنی اسی موروثی دولت کی حفاظت کو اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں۔

شعراء کڑپہ کے اسی سلسلتہ الذہب کی ایک کڑی مولانا ذوالفقار علی خان ابن گلاب خاں تھے ان کا لقب محمود خاں اور تخلص اختر تھا۔ ان کا نسبتی تعلق افغان پٹھانوں کے مشہور قبیلے سوریا زئی سے تھا۔ عہدِ آصف جاہی کے مشہور نائب وزیر اعظم چندو لال (دورِ ملازمت ۱۸۰۸ء تا ۱۸۴۳ء) کے ماموں صاحب اردو و فارسی کے قند آور ادیب لچھمی نارائن شفیق مصنف تذکرہ چمنستانِ شعراء کے آپ شاگرد رشید ہیں اور وہ حسان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی کے سلسلے کے فیض یافتہ تھے۔ جس کا ذکر حضرت اختر نے اپنے غیر مطبوعہ دیوان میں " در صفتِ استادی فرمایند" کے ذیل

میں کیا ہے۔

دیوانِ اختر قلمی ہے۔ تقریباً ساتؔ سے سو صفحات پر مشتمل اس فارسی دیوان میں ۲۳۶ غزلیں ہیں، شیخ سعدی کی معروف تصنیف کریما کے طرز پر حضرت اختر نے علیما، نعیما، قیوما، قدیما اور حکیما کے نام سے کئی رسائل لکھے جو دیوان اختر میں شامل ہیں۔ حکیما کی تصنیف ۱۲۵۵ھ میں ہوئی۔ دیوان میں کئی ایک مراثی بھی موجود ہیں جن میں سے ایک مرثیہ انھوں نے اپنے بیٹے عبدالوہاب خاں المتوفی ۱۲۵۸ھ کے انتقال پر کہا تھا جو نہایت اثر انگیز و پُر درد ہونے کے ساتھ ساتھ محبت پدری کے اضطراب کا آئینہ دار ہے۔ "در حسبِ حال" کے عنوان سے انھوں نے اپنے حالات نظم کئے ہیں، جس کی تاریخ ۱۲۲۸ھ ہے جیسا کہ اسی شعر سے ظاہر ہے:

ہزار و دو صد و بیست و بالائے ہشت ز ہجرت کہ ایں نغز نامہ نوشت

حضرت اختر کے پوتے مولانا ذوالفقار علی خاں ضیا المتوفی ۱۳۶۵ھ نے ان کی مدح میں جو اشعار کہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صاحبِ ولایت تھے آپ نے اپنے ہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا، آپ کے فیض یافتہ شاگردوں کی تعداد دو ہزار تک پہنچتی ہے اور آپ کے سارے خاندان میں " ایں خانہ تمام آفتاب است" کے مصداق علم و ادب کا چراغ روشن ہے اس تعلق سے حضرت ضیا کے اشعار ملاحظہ ہوں

فاضلِ شہر اختر ذی شاں ذات اقدس تھی جن کی فیض رساں

درس و تدریس کی تھی حرص و ہوس جن کے شاگرد دو ہزار تھے بس

عالم باعمل بہ زہد و رضا

بس ولایت کا جن کے تھا شہرا

ہاں کے روشن ضمیر ہیں وہ پیر	خلفِ نامدار بس شہ میر
محی دیں اسمِ اقدسِ والا	قدس اللہ سرہٗ ابدا!
فیض سے جن کے دل تھا آئینہ	جن کا سینہ تھا بوعلی سینا
نورِ اختر سے اقتباسِ شجاع	پھر طفیل شجاع سے یہ ضیا
ہے ضیا سے یہ انورِ تاباں	لطفِ یزداں سے ہو وحیدِ زماں

(حضرت ضیا کے والد ماجد جناب محبوب علی خان شجاع اور آپ کے فرزند نعمت اللہ خاں انور ہیں) حضرت اختر کا شمار صاحب دل شعرا میں ہوتا ہے، آپ علم شریعت وعلم طریقت کے مرجع البحرین تھے، آپ نے حضرت شہ میر اول کے فرزند کلاں حضرت سید شاہ محی الدین بادشاہ قادری المتوفی ۱۲۲۵ھ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت سے سرفراز کیے گئے۔ حضرت شاہ محی الدین شہ میر کا مزار شریف آستانہ شہ میر کڑپہ کے احاطہ میں واقع ہے۔

دیوانِ اختر کے ست رنگ جلووں کی ضیا پاشی بین نمایاں تر وجاذبِ نظر وہ مثنوی ہے جو حضرت ٹیپو سلطان شہید کے تعلق سے کہی گئی ہے۔ مثنوی کے جملہ اشعار ایک سو تین ہیں۔ اس کا پیرایۂ اظہار نہایت دلکش وسحر انگیز ہے۔ اشعار میں بے حد سلاست وروانی ہے۔ سلطان شہید کی مدح و توصیف میں خوب صورت استعارے اور نادر تشبیہات استعمال کی گئی ہیں شاعر نے سلطان کی للہیت و پرہیزگاری، شجاعت و بہادری، بخشش و فیاضی کے واقعات کو حسین شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ مثنوی کے ابتدائی چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شنیدم بشہر سری رنگ پٹن
شہے بود شہزادہ دل وپیل تن

اکتسابِ نظم

(میں نے سنا کہ سری رنگ پٹن نامی شہر میں شیر دل اور ہاتھی سا تن و توش
رکھنے والا بادشاہ تھا)

سر سروراں ٹیپو سلطاں بنام
سپہ پرور و رتبہ بخشِ انام

(سرداروں کے سرخیل کہ جس کا نام ٹیپو سلطان تھا وہ سپہ پرور اور لوگوں کے مراتب
بلند کرنے والا تھا)

جواں مرد و رستم نہاد و دلیر
چو روباہ در پیشِ او تند شیر

(جواں مرد، رستم سا بہادر اور دلیر تھا کہ جس کے آگے مست شیر بھی لومڑی بنا رہتا تھا)

مسلماں نواز و شہہ دیں پناہ
زسر بر رہِ شرع پیمودہ راہ

(مسلمانوں کو نوازنے والا بادشاہ کہ جس نے شریعت کی راہ سر کے بل طے کی تھی۔)

بدینِ محمد چناں استوار
چو کہہ قاف بر خاکداں استوار

(دینِ محمد پر اس طرح مضبوطی سے عمل پیرا تھا جیسے زمین پر کوہِ قاف استوار ہے)

حضرت اختر نے اس معرکہ آرا مثنوی کی ابتداء "شنیدم" (میں نے سنا) کے لفظ سے کی ہے۔ مگر ابتداء سے انتہا تک اس مثنوی کے کل اشعار میں کہیں بھی اس بات کی صراحت موجود نہیں ہے کہ حضرت سلطان شہیدؒ کے حالات شاعر نے کس سے سنے تھے، البتہ مثنوی کے اندازِ بیان کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سلطانِ شہید کے وہ تمام احوال جن کا ذکر شاعر نے بڑے

وثوق و اہمیت سے ... کیا ہے، کسی ایسے مستند و معتبر راوی سے ان تک پہنچے ہیں جس کا اعتبار بے داغ اور معیار بلند رہا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں جامعؔ دکن، صاحبِ مخزن العرفان شاہ کمالؒ المتوفی ۱۲۲۴ھ کی ذات والاصفات ہی اس دور کے سیاق و سباق میں سلطان شہیدؒ کی چشم دید گواہ اور ثقہ راوی ہو سکتی ہے۔ راقم کے مذکورہ قیاس کے لئے چند قرائن بھی ممد و معاون ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت شاہ کمال اور حضرت اختر دونوں ہم وطن ہونے کے علاوہ ہم عصر بھی ہیں۔ دوسرے یہ کہ دونوں حضرات کا سلسلۂ بیعت ایک ہی شجرۂ طوبیٰ سے منسلک ہے، یعنی حضرت شاہ کمال کے پیر و مرشد شہیر اولؒ ہیں۔ تو حضرت اختر کے شیخ و مقتدیٰ حضرت شاہ میر اول کے فرزندِ کلاں حضرت سید شاہ محی الدین شہ میریؒ ہیں۔ تیسرا سب سے اہم قابل غور پہلو یہ ہے کہ حضرت شاہ کمال سلطان شہید کی دعوت پر سری رنگ پٹن تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں ایک مدت قیام پذیر ہونے کے بعد شہادت ٹیپو سے قبل وطن لوٹ آئے تھے۔ سری رنگ پٹن کے قیام کے دوران حضرت شاہ کمال کو حضرت سلطان شہید کی قربت کے ساعات اور آپ کے شب و روز کو بغائر مطالعہ کرنے کے مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں۔ (بحوالہ شہ میری اولیا از حکیم سید محمود بخاری صـ۱۸۹) گویا حضرت شاہ کمال احوالِ سلطانی کے چشم دید گواہ تھے۔ مذکورہ قرائن کی روشنی میں یہ قول قرینِ قیاس ہے کہ حضرت اختر نے احوال سلطانی کا تفصیلی ذکر حضرت شاہ کمال کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے کیا ہوگا۔ اس ضمن میں چند تاریخی اشعار ملاحظہ ہوں:

گراں لشکرش بود نہصد ہزار

ہزار و دو صد پیل اندر شمار

(سلطان کے عظیم لشکر میں نو دہزار سپاہی تھے۔ بارہ سو ہاتھی موجود تھے)

مرہٹہ، مغل قوم انگریز ہم
ز رعب و ہیبتش تپاں بیش و کم

(مرہٹہ، مغل اور انگریز قوم اس کے رعب وداب کی گرمی سے جلتے اور پیچ وتاب کھاتے رہے ہیں۔)

بسا کافراں را مسلماں نمود
بایشاں رہِ دین و ایماں نمود

(بہت سے کافروں کو مسلمان کیا، دین و ایمان کی راہ دکھلائی)

فرنگی و مغل و مرہٹہ تمام
نمودند در کشتنش اژدہام

(انگریز مغل مرہٹے سب آپ کی جان کے درپے ہو گئے تھے)

وفاتش بتاریخ الحال گیر
ہزار و دو صد و سیزدہ سال گیر

(سلطان کی شہادت کی تاریخ ۱۲۱۳ ھ ہے)

حضرت اختر نے سلطان شہید کے اوصافِ حمیدہ کی تعریف و توصیف میں نہ صرف شعری تقاضوں کو پورا کیا بلکہ حقیقت پسندی کا بھرپور اظہار بھی کیا ہے۔ نمونتاً چند شعر پیش کئے جا رہے ہیں۔

سراپا تحمل دلش برقرار نمازی و شب خیز و پرہیزگار

(سلطان سراپا تحمل تھا، وہ مطمئن القلب تھا، نمازی تہجد گزار اور متقی تھا۔)

دلش بود تیغے بآبِ علوم ولے نرم از عاجزی ہمچو موم

(اس کا دل جوہر علوم سے صیقل شدہ تلوار تھا لیکن خاکساری کی وجہ موم کی طرح نرم بن گیا تھا)

اکتسابِ نظر

نویسندۂ خوب زرّیں قلم   باوراق خورشید و مہ زد رقم

(وہ خوش خط تھا، اس نے زریں قلم سے شمس و قمر کے اوراق پر اپنی تاریخ ثبت کر دی تھی۔)

زباں آوراں را نوازش نمود   ز گنج و ز اقبال عزت فزود

(اس نے ادباء شعراء کی قدر دانی کی اور انھیں دولت و عزت سے سرفراز کیا۔)

بجاں دوست می داشت خوانندہ را   نویسندۂ و علم و دانندہ را

(اہلِ علم و صاحب قلم حضرات کو اپنا جگری دوست بنا رکھا تھا۔)

مذکورہ اشعار پر دوبارہ نظر فرمایئے پھر سلطانِ شہید کے مصاحب و درباری منشی اور تاریخ سلطانی کے اولین مورخ میر حسن علی کرمانی ولد سید عبدالقادر کرمانی کی اس شہادت کو ملاحظہ فرمائیے۔ تو حضرت اختر کی اشعار کی حقانیت و صحت روزِ روشن کی طرح نمودار ہوگی۔ جناب کرمانی رقم طراز ہیں: اہلِ ہنر کی عزت و توقیر میں ان کو بڑا اہتمام رہتا تھا، سلطان کی عادت تھی کہ فرامین و پروانہ جات اور احکامات کے سرنامے پر اپنے ہاتھ سے پوری بسم اللہ خطِ طغریٰ میں لکھتے پھر اس کے نیچے دستخط کیا کرتے تھے۔ (نشانِ حیدری ص ص ۱۴۴ تا ۴۴۴)

حضرت ٹیپو سلطان شہید کے معاصر مشہور و معروف شعرائے کرام میں سے چند ایک نے فقط سلطان کے مراثی اور مثنویاں لکھی ہیں مثلاً میر حسن علی کرمانی، متخلص بہ حاکم منشی منجم غلام حسین عاصی، منشی عابد علی عابد، احسن اللہ غوثی چنگل پیٹی (مدراس) اس دور کے بہت سے شعراء بقول پروفیسر میر محمود حسین صاحب باوجود سلطانِ شہید سے گہری ہمدردی و یگانگت کے انگریز فاتحین کے خوف سے اپنی منظوم عقیدت کا اظہار بہ سرِ عام کر نہ سکے۔

حضرت اختر نے سلطان شہید کی شجاعت و بہادری کے نادر نمونے

پیش کرتے ہوئے بلند آہنگی کے ساتھ ساتھ رفعتِ خیالی کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ چند منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

عدو را چناں برد در روزِ جنگ — کہ کنجشک را باز گیرد بہ چنگ

(دشمن کو جنگ کے وقت اس طرح قابو میں کیا تھا جیسا کہ شکرا چڑیا کو اپنے پنجے میں دبوچ لیتا ہے)

ز شمشیر دریائے خوں شد رواں — درو غوطہ خوردند پیر و جواں

(سلطان کی تلوار سے خون کا دریا بہہ نکلا کہ جس میں پیر و جواں غوطہ کھانے لگے تھے)

ز خونِ تنِ خستہ و چاک چاک — بہ رخ پردۂ سرخ افگند خاک

(بدحال اور زخموں سے چور جسموں سے بہنے والے لہو سے پریشان ہو کر زمین نے اپنے چہرے پر لال نقاب ڈال لیا تھا)

دلِ سنگ شد خستہ از نوکِ تیر — ز پستانِ او خوں رواں شد چو شیر

(پتھر کا دل سلطان کی نوک سے ایسا زخمی ہوا کہ اس کے سینے سے دودھ کی طرح خون بہہ نکلا)

تفِ تیغ کرد آسماں را سیاہ — چناں کز دلِ سوختہ دودِ آہ

(تلوار کے بخارات نے آسماں کو اس طرح سیاہ کر دیا جیسے دل جلے کی آہ کا دھواں کالا کر دیتا ہے)

دمِ تیغ شد آں، چناں کارگر — کز یک ضرب افگند ہفتاد سر

(تلوار کی دھار وہ کرشمہ دکھائی کہ ایک ہی وار سے ستّر سر قلم ہو گئے)

بہر حال اسی قبیل کے سیکڑوں اشعار حضرت اختر کی مثنوی میں اس طرح پیش ہوئے ہیں۔ جیسے مرصع زیور میں نگینے سلیقے سے جڑے گئے ہوں۔)

حضرت اختر نے سلطانِ شہید کے عدل و انصاف کے روشن و تابناک

گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ مزید چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بانصاف می داشت آں دشت برد   کزیک چشمہ گورو پلنگ آب خورد

(سلطان کے نظم و نسق نے اس طرح انصاف کیا کہ ایک ہی گھاٹ پر جنگلی گدھا اور چیتا دونوں مل کر پانی پیتے تھے)

بفرِّ فریدوں جہاں داشتہ   ہمہ تخم عدل و کرم داشتہ

(اس نے فریدوں جیسے کروفر کے ساتھ حکمرانی کی عدل و انصاف کے بیج ہر جگہ بوئے تھے)

زعدلش بآہو برہ مادہ شیر   شد از شیر دادن چو مادہ دلیر

(اس کے عدل کی تاثیر سے ہرن کا بچہ شیرنی کا دودھ پی کر شیر جیسا بن گیا تھا)

چو کسریٰ شہے چند انصاف راند   بفرقِ جہاں درّ نیکی فشاند

(کسریٰ کی طرح عدل و انصاف کے ساتھ اس نے مختصر مدت حکومت کی اور دنیا کی مانگ موتیوں سے سجادی۔)

حضرت اختر نے شہادتِ سلطان کے بعد رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے یہ عجیب و غریب بات کہی کہ واقعۂ شہادت کے بعد ملک میں قحط سالی نمودار ہوئی، لوگ روٹی روٹی کو ترسنے لگے۔ فاقہ کشی کی وجہ سے عوام الناس مرکھپنے لگے گویا خدائے تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ کیوں نہ ہوتا جب کہ سلطان شہیدؒ "صاحب السیف والقلم" تھے۔ مجمع البحرین تھے۔ عادل حکمران عالم دین ہو تو اس کی وفات بمصداق موت العالم موتُ العالَم دوہری مصیبت اور دگنے نقصان کا باعث ہوتا ہے اس لطیف نکتے کی طرف شاید ہی کسی کی نظر گئی ہو۔ اس ضمن میں رقم شدہ اشعار صاحبِ بصیرت کے لئے عبرت و نصیحت کا سرچشمہ ہیں۔

جہاں خوار گردید از رفتنش | فلک زار گردید از رفتنش

(دنیا اس کے چلے جانے سے رسوا ہو گئی اس کے اٹھ جانے پر زار و قطار رونے لگا تھا۔)

مگر رزق را بود باعث بخلق | سپہ بود ازو خرم و اہل دلق

(لیکن وہ مخلوق کی روزی کا سبب بنا تھا، اس کی ذات سے سپاہی و صوفی دونوں خوش تھے۔)

زفاقہ کنوں خلق شد بس ہلاک | دہن ہا بجائے شکر پر زخاک

(اب فاقے کی وجہ سے لوگ ہلاک ہونے لگے اور اپنا منہ بجائے شکر، مٹی سے بھرنے لگے)

بدو رزقِ جمہور موقوف شد | قضا نام رزق از خلائق ربود

(اس پر عوام کی روزی موقوف تھی، موت نے اس کے بعد روزی کے نام ہی کو مٹا دیا تھا۔)

نہ بینند در خواب جز روئے آں | کہ آید بخواب آں چہ گردد بجاں

(لوگوں کے سپنے میں بھی روٹی کا چہرہ نظر آتا تھا کیوں کہ جو چیز دل میں بستی ہے وہی سپنے میں دکھائی دیتی ہے۔)

بہ ہم راہِ او رفت روزیِ خلق | زرنگِ جہاں دل فروزیِ خلق

(اسی کے ساتھ مخلوق کی روزی جاتی رہی، دنیا کی رنگا رنگی اور لوگوں کی دل جمعی ختم ہو گئی۔)

چو شہ رخت بندد بملک فنا | شود راہِ سختی سوئے خلق وا

(جب بادشاہ ملکِ عدم کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے تو مخلوق کی سمت مصیبتوں کی راہ کھل جاتی ہے)

بہر حال اس طویل مثنوی کے ذخیرے سے مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق مذکورہ چند اشعار منتخب کئے گئے تاکہ اس مثنوی کے مختلف زاویوں پر اصحابِ علم و فضل کی بصیرت افروز نگاہ مرکوز ہو سکے۔ یقیناً حضرت اختر کی یہ معرکۃ آراء مثنوی "ادبیات سلطانی" میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ اور ان شاء اللہ تعالیٰ دانشور و اہلِ نظر

حضرات سے دادِ تحسین حاصل کرے گی۔

راقم الحروف دیوان اختر تک اپنی رسائی کے سلسلے میں جناب محترم سید احمد باشاہ عرف بڑکلی باشاہ صاحب کا شکرگزار ہے اور اس ادب پاسے کی رونمائی اور اس سے فیض یابی خالوادۂ حضرت اختر کے چشم و چراغ جناب ذوالفقار علی خاں چہارم کی خیرخواہی و نیک نیتی کی مرہونِ منت ہے۔ "جزاکم اللہ خیراً"

نوٹ : نوابان کڑپہ کے دورِ اقتدار کی تاریخیں

PERSIAN MANUSCRIPTS FROM

THE MACKENZI COLLECTION-

سے حاصل کی گئی ہیں۔

وشارم میں اُردو کا ارتقاء

مشہور تاریخی شہر آرکاٹ کے پہلو میں آباد ، دولت و ثروت سے شاد ، سرزمین "وشارم" جس کا قدیم نام 'حراست پور' ہے۔ تقریباً تین صدیوں سے اردو کی زیرِ حراست رہی ہے۔ 'حراست پور' کی وجہ تسمیہ کے تعلق سے راقم الحروف رو برو دورانِ گفتگو پروفیسر محبوب پاشا مدراسی مدظلہ' نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہاں نوابانِ آرکاٹ کے دورِ حکومت میں قیدیوں کو زیرِ حراست رکھا جاتا تھا۔ اسی لئے یہ بستی حراست پور کے نام سے مشہور ہوئی۔

راقم کی رائے میں مذکورہ خیال کے لئے کوئی تاریخی یا دستاویزی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہاں نہ کوئی ایسا کھنڈر ہے اور نہ ایسے آثار کہ جن پر حوالات کا گمان کیا کیا جا سکے البتہ یہ بات قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ 'حراست پور' دراصل والیٔ سات گڈھ نواب حراست خاں (۱۱۶۵ھ) کی طرف منسوب ہے جن کا نوابانِ آرکاٹ کے دربار میں کافی اثر و رسوخ تھا اور ان کے تعلقات اتنے وسیع تھے کہ انہوں نے اپنے چہیتے

مصاحب اور اس دور کے بلند پایہ شاعر ولی ویلوری کو بعض ناگفتہ بہ حالات کے سبب شہر کڑپہ کے نواب عبدالمجید خان میانہ (المتوفی ۱۱۶۹ھ) کے پاس سفارشی پیغام کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ جس کا اعتراف ولی ویلوری نے اپنی ضخیم مثنوی 'رتن پدم' میں جس کو حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب 'اردوئے قدیم" میں بربنائے مغالطہ پہلی مثنوی قرار دیا ہے۔ ان اشعار میں کیا ہے :-

حراست خان امیر ایک نامور تھا
سکونت گاہ اوسکوں سات گڈھ تھا

اتھا وہ اہل درد و نیک اعمال
رفاقت میں اتھا میں اس کے خوش حال
قضا را واں سوں ہو قسمت بے برخواست
سو آیا میں طرف کڈپہ کے دھر خواست
نواب عبدالمجید ابن الحمید ایک
اتھا وان نامور صوبہ سعید ایک

" حراست پور کی وجہ تسمیہ کے تعلق سے پیش کردہ قیاس پر مزید دلیل و تقویت مخزونہ اسد صوٹ (علاقہ کڈپہ) کے نادر و نایاب مخطوطہ" انشائے حراست الصنائع " سے حاصل ہوتی ہے۔ دراصل " انشائے حراست الصنائع " نواب سات گڑھ حراست خاں قدس اللہ عزہ و قدرہ کی طرف منسوب ہے جسے لالہ یال چند ولد نہال چند المتخلص بہ نیازی نے تصنیف کی تھی، مصنف قوم کایستھ سے متعلق ہونے کے باوجود اپنی کتاب کے آغاز میں اس نے حمد و نعت کے بعد مدح پیر و مرشد کے تحت حضرت میر محمد فضل اللہ قدس اللہ سرہ العزیز کی منقبت بیان کی۔ حضرت سید شاہ فضل اللہ قادری کی وشارم

اکتسابِ نظر

ہی میں سی۔ عبدالحکیم کالج کے روبرو سڑک کی دوسری جانب تاحال موجود ہے۔ مصنف لالہ بالچند نے "در توصیفِ پادشاہ" کے عنوان کے تحت سلطان محمد شاہ غازی (عہدِ حکومت ۱۱۳۱ھ — ۱۱۶۱ھ) کی مدح سرائی کی ہے۔

الغرض مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ کہ نواب حراست خاں جو حضرت شاہ زین الدین عرف شاہ صاحب بیجاپوری صبغۃ اللٰہی (المتوفی ۱۱۲۹ھ) کے مرید بھی تھے، اپنے وقت کے بارسوخ اور صاحب عزّ و اقتدار نواب تھے، اسی لیے ادبا و شعراء اپنی کتابیں موصوف کی طرف منسوب کرتے تھے اس صورت حال کے پیش نظر ایک چھوٹے سے قصبہ کو مذکورہ نواب کی طرف منسوب کرنا کوا لعجبی نہیں ہے۔

بہرحال حراست پور، یعنی وشارم کی قدیم آبادی شہر آرکاٹ کی فصیل کے باہر سے شروع ہوتی ہے۔ یہ وہی فصیل شہر ہے۔ جس کے آثار آج بھی "سی۔ عبدالحکیم کالج" کے روبرو نظر آتے ہیں۔ وہاں سے قریب مغرب کی سمت ایک پہاڑی ہے۔ جس کا اصل نام "باوا آدم کی پہاڑی" تھا۔ جس کا تلفظ مرورِ زمانہ و کثرتِ استعمال کے سبب بگڑ کر آج "بادم پہاڑ" ہوگیا ہے۔ اسی پہاڑ کے درے میں حضرت شاہ میراں حسینی مصنفِ "خلاصۃ الرویہ" المعروف بہ منزوی الجبلین (دو پہاڑیوں کے درمیان زاویہ نشین) کا مزار تاحال مرجع انام و زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔ غالباً یہی وہ بزرگ ہیں جن کے سر "وشارم" میں قدیم اردو یعنی دکنی کی داغ بیل ڈالنے اور اس کو رواج دینے کا سہرا باندھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر حبیب النساء صاحبہ نے اپنی تصنیف "جواہرات میسور" میں حضرت شاہ میراں حسینیؒ کے حالات بیان کئے ہیں اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے: —

"حضرت شاہ میراں حسینیؒ سلسلۂ بندہ نواز گیسودراز قدس سرہٗ

کے نامور اکابرین میں سے ہیں۔ آپ صاحب تصنیف بزرگ ہیں۔ آپ کا دکنی رسالہ "سبع صفات" ہے آپ بارھویں صدی ہجری کے مشائخین عظام میں سے تھے۔ آپ اکثر آدم کی پہاڑی پر مصروفِ ریاضت و محوِ عبادت رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی پہاڑ سے اتر کر ارشاد و ہدایت سے خلائق کو بہرہ مند فرماتے تھے۔ والیٔ آرکاٹ نواب سعادت اللہ خاں (المتوفی ۱۷۳۲ء) نے بمعرفت دلدار خان نلمنگل کے سات قریے آپ کو بطور جاگیر عطا کئے تھے (مگر حضرت نے وہاں جانا پسند نہیں کیا بلکہ آدم پہاڑی کو اپنا مستقل دارالسکونت بنا لیا اور یہیں آپ کا وصال ۱۱۴۰ھ میں ہوا) آپ کے ایک فرزند ارجمند حضرت شاہ صدرالدین نلمنگلی (بنگلور) ہیں۔ جن کی کتاب "مرأۃ لاذکار" کے مخطوطہ میں بقول ڈاکٹر حبیب النساء صاحبہ یوں درج ہے:

"ایں رسالہ 'مراۃ الاذکار' تصنیف حضرت شاہ صدرالدین ولد شاہ میراں حسینی رح ولی اللہ منزوی الجبلین قدس سرہٗ۔"

"جواہرات میسور کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ میراں حسینی رح کے مریدوں میں اس دور کے جید علماء، صوفیاء اور شعراء کرام شامل تھے۔ انھیں میں سے آپ کے شاگرد و خلیفہ حضرت شاہ محمد آرکاٹی ہیں۔ جن کی دو ضخیم مثنویاں "خزانہ عبادت" اور "خزانہ معرفت"[1] اورینٹل ریسرچ لائبریری، میسور میں موجود ہیں۔ خزانہ عبادت پہلی مرتبہ ۱۱۲۵ھ میں لکھی گئی بعد ازاں ۱۱۸۲ھ میں اس پر نظر ثانی کی گئی۔ "خزانہ عبادت" کے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے پیر و مرشد حضرت شاہ میراں حسینی ولی اللہ آدم کی پہاڑی میں اکثر قیام پذیر ہوتے تھے۔ آپ صاحب کرامت بزرگ تھے۔ جنگلی جانور

1. خزانہ معرفت اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری مدراس میں موجود ہے اور راقم کی نظر سے گزری ہے۔ اس مثنوی میں بھی شاعر نے اپنے پیر و مرشد کی خوب تعریف کی ہے۔

بھی آپ کے مطیع تھے۔ لوگ باگ سب آپ کی بے انتہا عزت و خدمت کرتے تھے۔
حضرت شاہ محمد آرکاٹی نے "خزانۂ عبادت" کی تمہید میں اپنے شیخ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کئی شعر قلمبند کئے ہیں۔ ان میں چند پیش خدمت ہیں :

صدی یارھویں کے ولیاں میں سکل
ولی ہنکی یو شاہ میراں لنوں

کرامات ان کے ہے کئی سربسر
ہر یک ہور مشہور نگری[1] نگر

میں کہتا ہوں بوجھو کے اے خاص و عام
حضوری میں تھا شیر ان کی مدام

تہجد کے وقتوں وظیفہ پڑھتے
ادب سات آبیٹ کر سامنے

کہ جو کر و تھے لاند کے ریختہ ویاک[2]
بھی رکھوالی حجرے کا تھا ایک ناگ[3]

---

[1] نگری نگر
[2] ناگ

الغرض شاہ میراں ولی اللہ قدس سرہٗ کے ہاتھوں خو بصورت رشد و ہدایت لگایا گیا یہ اردو کا پودا خوب پھولا پھلا اور ایک طویل مدت تک بار آور ہوتا رہا۔ اس کے ایک عرصہ بعد اسی سرزمینِ وشارم کے آب و ہوا کے پروردہ، بحر اردو کے شناور جناب عبدالرحیم گوہر اپنے جواہر پاروں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ حضرت گوہر کو بعض حضرات نے ویلوری ثابت کیا ہے۔ حالاں کہ "غزلیات گوہر" کے سرورق پر موجودہ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جناب گوہر "حراست پور" یعنی وشارم کے متوطن ہیں، مذکورہ عبارت یہ ہے:

"تصنیف شاعرِ شیریں بیاں، سحر بیان طبع سلیم جناب محمد عبدالرحیم گوہر، ساکنِ حراست پور، لمتصل آرکاٹ"

گوہر وشارمی کے کلام میں سادگی و شیفتگی زیادہ ہے۔ دکنی اثرات اشعار میں نمایاں ہیں۔ آپ کو حضرت ابراہیم کیفی ویلوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا کلام ۱۳۰۴ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں غزلیات گوہر، مطبع احمدی مدراس سے شائع ہوا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو: ؎

مردمِ چشم کے مانند ہمیشہ گوہر
زندگی کرتے ہیں ہم اپنی بسر پانی میں

آگ لگ جائیگی دامانِ فلک کو گوہر
شعلۂ آہ کو واللہ نہ تم بھڑکاؤ

دورِ گوہر کے برسوں بعد جب شہر وشارم میں اس کی چمک دمک ذرا ماند پڑ گئی تو وارفتگانِ شمع اردو نے اس کی ضیا کو از سر نو تازہ و تابندہ کرتے کے

لئے ۱۹۴۱ء میں سر جوڑ کر سنجیدگی سے اس صورت حال کا جائزہ لیا اور وشارم میں پہلی بار "انجمنِ ترقی اردو" قائم کی۔

اسی انجمن سے ۱۹۴۲ء میں شائع شدہ "گلدستہ" نامی مجلہ میں انجمن ہذا کے معتمدِ عمومی جناب اے۔ احمد پاشاہ صاحب ایم۔ اے نے قیام انجمن کی تفصیل بیان کی ہے۔

"مدت سے یہاں ضلع شمالی آرکاٹ میں اس بات کا احساس تھا کہ ادبِ اردو کی خدمت کے لئے "انجمنِ ترقی اردو" قائم ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ایس۔ ایم۔ عبدالجمیل صاحب اجمل نے اس کو عملی جامہ پہنایا۔ آپ کے اہتمام سے بتاریخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء بروز شنبہ بعد نماز عصر مسلمانانِ میل وشارم کا ایک عام جلسہ عالی جناب سی۔ عبدالوہاب صاحب کی زیر صدارت اسلامیہ ہائی اسکول میں ہوا۔ جس میں افضل العلماء مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب ایم اے، ڈی فل (آکسن) پرنسپل گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس نے زبانِ اردو کی اہمیت اور ترقی کی ضرورت پر ایک مبسوط اور مدلل تقریر فرمائی۔ جس کا حاضرین پر بہت ہی اچھا اثر ہوا اور اس جلسے میں فیصلہ کیا گیا کہ یہاں انجمن ترقی اردو قائم کی جائے اس کے بعد بتاریخ ۹ نومبر ۱۹۴۱ء بروز یکشنبہ ایک اور جلسہ عالی جناب عبدالوہاب صاحب کی زیر صدارت مدرسۂ مذکور میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں انجمن کی باقاعدہ تشکیل عمل میں آئی۔ بالاتفاق عہدیداروں اور اراکینِ مجلسِ منتظمہ کا انتخاب کیا گیا۔"

تقریباً اس مذکورہ اجلاس کے دس سال بعد اسی شمع اردو کی لو بڑھانے کے لئے حضرت محمد حسین محوی صدیقی لکھنوی (۱۸۹۱ء — ۱۹۷۵ء) مدراس یونیورسٹی سے اپنی وظیفہ یابی کے بعد وادیٔ میل وشارم ہوئے۔ حضرت محوی

کا مستحکم تعلق وشارم سے ۱۹۵۵ء میں قائم ہوا۔ آپ نے میل وشارم کی آب و ہوا میں اردو کی لطافت و نزاکت کو پھیلانے کے سلسلہ میں اہم فرائض انجام دئے۔ آپ کے دور میں وہاں ادبی نشستیں، مشاعرے خوب منعقد ہوتے رہے۔ آپ نے شہر وشارم سے دو ماہ نامے ”الارشاد“ (مذہبی) اور معیار ادب“ (ادبی) جاری کئے۔

جناب ایم جی سعداللہ ممتاز مدراسی نے پاکستان سے شائع شدہ ماہ نامہ ”نوائے وقت“ میں حضرت محوی صدیقی کی مساعی جمیلہ کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے شہر وشارم کا خاکہ کیا پیش کیا بلکہ اپنے الفاظ میں خاکہ اڑایا ہے:

”میل وشارم صوبہ مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ کا ایک قصبہ تھا۔ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ مگر ان کی مادری زبان ٹمل تھی۔ نہ وہاں کوئی پریس تھا نہ اردو کا قدرداں، ریلوے اسٹیشن بھی نہ تھا۔ چھپائی کا انتظام اسّی میل دور بنگلور میں ہوتا تھا۔ اور کتابت کے لئے ایک کاتب کو بھوپال سے بلوایا گیا تھا۔“

جناب ممتاز مدراسی نے مذکورہ عبارت میں ”جو قصبہ تھا، آبادی تھی“ کہا ہے وہ قصبہ بفضلہ تعالیٰ آج بھی آباد و شاداب ہے اور وہاں ابتداء ہی سے اردو کے قدرداں رہے ہیں۔ انھیں قدرد انوں کے جذبات کا ثمرہ ہے کہ حضرت محوی کو وشارم آنے کی دعوت دی گئی۔

ہمارے اسی احساسِ کمتری کا ثبوت جناب ڈاکٹر عبدالحق کرنولی مرحوم کے مضمون ”جنوبی ہند میں اردو“ کے حصہ سے ملتا ہے۔ جہاں ڈاکٹر صاحب نے حضرت محوی کی ثناخوانی کرتے ہوئے تحریر کی ہے:

علامہ محوی لکھنوی نے مدراس میں اس وقت قدم رکھا جب کہ جنوبی ہند میں اردو کا کوئی نام لیوا نہیں تھا۔ چناں چہ ”مشاعرے“ سے روشناس

کرانے میں علامہ کو کئی سال ایسی جد و جہد کرنی پڑی کہ اردو کی یہ خدمت اگر وہ شمالی ہند میں انجام دیتے تو آج اردو کو موجودہ حالات کا سامنا نہ ہوتا۔"

انھیں مبالغہ آرائیوں سے متاثر ہو کر حضرت علامہ محوی نے بھی بذاتِ خود اسی قبیل کا دعویٰ فرمایا تھا۔ جس کی تفصیل ہند و پاک کے مشہور معروف شاعر جناب علیم صبا نویدی نے اپنی تازہ تصنیف "تمل ناڈو میں اردو" میں اس طرح پیش کی ہے:

"حضرت محمد حسین محوی جو مدراس یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے ، آمبور میں بھی اپنے بہت شاگرد بنا رکھے تھے۔ ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے کچھ ترفع سے کام لیا اور عام لوگوں کے سامنے کہہ دیا کہ مدراس میں ان کی وجہ سے اردو زبان پھیلی۔ عبد العزیز فہیم آمبوری بھی اس محفل میں موجود تھے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ فوراً ایک فی البدیہہ غزل کہہ کر بھرے مجمع میں پڑھ ڈالی۔ جس کا مطلع یوں تھا۔

مدراسیوں میں نکلے اردو زبان والے
اب کیا کریں گے دعویٰ ہندوستان والے۔

اسی دور میں ۱۹۵۵ء میں جناب محمد زکریا صاحب ذکی وشارمی کی زیرِ صدارت "گلستاں" ماہانہ شائع ہوتا رہا اور انہیں دنوں حضرت عزیز رومی وشارمی کا مجموعۂ کلام "درّۂ فاروقی"، و "ضربِ حیدری" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

الغرض شہر وشارم میں اردو کل بھی تھی آج بھی ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی اسی آب و تاب کے ساتھ باقی رہیگا۔

شہرِ وشارم میں اردو زبان کی خدمت دامے درمے کرنے والوں میں نواب سی عبد الحکیم صاحب [المتوفی ۱۹۳۵ء] کا نام نامی بہت اہم ہے۔

جن کے کارناموں پر مولانا حافظ باقوی کی کتاب "مخبرِ اعظم" میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے علاوہ مشاہیر میں آلبخی محمد عثمان صاحب (۱۳۱۴ھ) پاکتنی قادر پاشاہ صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح یہاں کے ممتاز شاعر استاذ سخن حضرت عبدالقدوس شاداں وشارمی کی ادبی خدمات بھی قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہی نہیں بلکہ وشارم کی اردو تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔

بہر حال آج وشارم میں موجودہ سی۔ عبدالحکیم کالج، ہائی اسکول، مدراس مثلاً منبع الحسنات ومفتاح العلوم، دار المطالع اور نشر واشاعت کی انجمنیں مثلاً خیر جاریہ، اشاعت الحسنات اور کتاب گھر جس سے سیکڑوں نصابی کتابیں علمی وادبی رسالے شائع ہوتے رہے۔ اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی وترویج کی منہ بولی تصویر پیش کر رہی ہیں:

شہر وشارم میں دورِ حاضر کے شعراء وادباء میں چند معروف نام حسبِ ذیل ہیں:-

حضرت مولانا نیر ربانی۔ ایم اے آپ کے کلام میں روایت ودرایت کا امتزاج لطف دے جاتا ہے۔

مولانا حافظ عبدالرزاق راجوٹی ایم اے ایم فل: المعروف بہ حافظ باقوی: آپ کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں: بچوں کے لئے آپ نے نظمیں خوب لکھی ہیں۔ جن کے مجموعے "چاندتارے، نئی کلیاں وغیرہ کافی مقبول ہوئیں۔ "قمر نامۂ اسلام" کے نام سے منظوم سیرت طبع ہو چکی ہے آپ کی تخلیقات بڑوں سے بڑھ کر چھوٹوں کے لئے بہت مفید ہیں۔

پروفیسر عبدالرحمن صبا وشارمی: آپ کی نظمیں اور غزلیں ہندوستان

کے معتدر رسائل میں جگہ پا چکی ہیں۔ آپ کا میلان صالح اور جدید رجحانات کی سمت ہے آپ کے قطعات زبان زد خاص و عام ہیں۔

محترمہ امیر الضیاء وشارمی: آپ سی عبد الحکیم کالج کے کرسپانڈنٹ جناب ضیاء الدین احمد صاحب کی اہلیۂ محترمہ ہیں۔ آپ اچھی قلم کار ہیں۔ آپ کا ایک ناول "عنبرین" کافی مقبول ہوا ہے آپ کی تحریر میں سنجیدگی پائی جاتی ہے اور اس پہ صاف وشفاف جھیل کی روانی کا گمان ہوتا ہے۔

اِس مضمون کی تیاری میں حسبِ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱۔ "غزلیات گوہر" مطبوعہ ۱۸۷۷ء از جناب عبد الرحیم گوہر
۲۔ "گلدستہ" مطبوعہ ۱۹۶۲ء انجمن ترقی اردو میل وشارم
۳۔ "ماہنامہ" گلستان" ۱۹۵۵ء مدیر جناب محمد ذکریا ذکی
۴۔ 'جواہرات میسور' مطبوعہ ۱۹۶۷ء ڈاکٹر حبیب النساء فاطمہ وظیفہ یاب میسور یونیورسٹی، میسور
۵۔ ماہنامہ 'اسباق' جلد ۳ ۱۹۸۳ء علامہ محوی صدیقی نمبر
۶۔ سخنورانِ ویلور: ۲ ۱۹۸۹ء، مرتب ڈاکٹر مظفر شہمیری
۷۔ ٹمل ناڈو میں اردو (غیر مطبوعہ) جناب علیم صبا نویدی
۸۔ انشائے حراست الصالح (مخطوطہ) کتب خانہ سید احمد باشاہ قادری عرف صاحب وظیفہ یاب پولیس کانسٹیبل سدھوٹ ضلع کڑپہ
۹۔ ترجمہ روضۃ الاولیاء از شاہ سیف اللہ قادری، مطبوعہ ۱۲۱۲ھ مطبع صبغۃ اللہی رائچور علاقہ، حیدرآباد دکن

جنگِ آزادی اور علماءِ جنوب

ہندوستان کی تاریخ جنگِ آزادی اپنے دامن میں عبرت و نصیحت کے بے شمار خزانے چھپائے ہوئے ہے۔ دیدۂ بینا کی نگاہِ حقیقت شناس ہی اس دولت نایاب سے کماحقہ' فیضیاب ہو سکتی ہے۔ کور چشموں کے لئے اس خزانے سے سوائے محرومی و ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔

تاریخ جنگ آزادی کا مطالعہ کرتے وقت ہر ذہین قاری کے روبرو یہ سوال ورق ورق ابھرتا ہے کہ اس معرکہ آرائی میں شمالی ہند کے زعمائے قوم کا عموماً اور علمائے کرام کا خصوصاً اہم حصہ رہا ہے جو آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہے اور وطن عزیز کی آزادی کے لئے طبقہ علماء کی بے لوث قربانیاں متعصب مورخوں کی کاوشِ بسیار کے باوجود پوری طرح مسخ نہیں کی جا سکی ہیں، لیکن ان تمام حقائق کے بالکل برعکس جنگِ آزادی میں علمائے جنوب کا کھلا موقف اور عملی کارگردگی کا واضح تعین تا حال پوری طرح ضبط تحریر کیوں نہیں کیا جا سکا ہے ـــ ؟

الکتاب نظر

زوالِ سلطنت مغلیہ کے بعد ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا حقیقی قبضہ ہونے لگا تو جنوب کے علمائے کرام نے اپنے داعیانہ مزاج کے عین مطابق نئے حکمرانوں کے ساتھ ایک گونہ ہم آہنگی پیدا کر لی تھی، جس کے نتیجہ میں ان حکمرانوں سے مروت و اخلاق کا برتاؤ ہونے لگا اور ہر طرح کی معرکہ آرائی سے گریز کیا گیا۔ جب انگریز حاکم اپنے انتظامی مصالح کے تحت علمائے کرام کی بارگاہوں اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں پر حاضری دیتے تو یہ حضرات اپنے مکارم اخلاق کا ثبوت دیتے ہوئے کشادہ قلبی اور وسیع نظری سے ان حاکموں کا استقبال کیا کرتے تھے۔ اس بلند کرداری کا مثبت اثر یہ رونما ہوا کہ مذکورہ حکمران ان حضرات کے علمی و اشاعتی کاموں سے صرف نظر ہی نہیں کرتے بلکہ اشاعتِ دین و دعوت حق کے معاملے میں خود بھی معاون و مددگار بن جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ریاستوں کے مقابلے میں جنوبی ریاستوں میں انگریزی عہد میں بھی تبلیغ دین و اشاعتِ اسلام کی رفتار تیز تیز رہی بلکہ بحمد اللہ اشاعت دین کا سلسلہ اس دور پر فتن میں بھی بہر طور جاری و ساری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند کے حالات و حوادث کے مطابق وہاں کے علمائے کرام نے براہ راست انگریزوں سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جس کے نتائج اس قدر سنگین نکلے کہ انہیں اپنا علمی مشغلہ پس پشت ڈال کر سرگرم سیاست رہنا پڑا، اور یہاں اشاعت اسلام کی رونق اس طرح ماند پڑتی گئی کہ بالآخر اس کے مضر اثرات عام طور پر محسوس کیے جانے لگے ہیں۔ بقول مولانا مولوی سید اسعد مدنی صاحب صدر جمیعۃ العلماء ہند، میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ (حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحم) سے سنا ہے کہ کلکتہ کی مسجد جو "مسجد ناخدا" کے نام سے مشہور ہے، صرف اس ایک مسجد میں تقسیم سے پہلے یہ حال تھا کہ ہر روز تقریباً ایک سو آدمی آ کر اسلام قبول کرتے تھے۔

(تقسیم سے پہلے کچھ دنوں تک حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ مسجد نا خدا، میں خطیب تھے) یہی کیفیت پہلے سارے ملک میں تھی۔ ہر روز لوگ سیکڑوں کی تعداد میں اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ سب کچھ تقسیم کی منافرت کی پالیسی کے نتیجے میں ختم ہو گیا ہے"

جنوبی ہند میں علمائے کرام وصوفیائے عظام کا رویہ بالکل اس کے برعکس رہا، یہاں کے علماء نے انگریزوں سے معرکہ آزادی کو اپنا نصب العین نہیں بنایا چوں کہ انکے مدِ نظر دعوتِ دین واشاعت اسلام کا عظیم مشن تھا اس لئے انھوں نے انگریزوں کے تعلق سے اپنا موقف واضح کرتے ہوئے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا تھا۔ کہ انگریز جب ہمارے بیشتر امور کے اجراء میں مداخلت نہیں کر رہے ہیں اور ہمیں اپنی عبادتوں مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی میں کامل ومکمل آزادی حاصل ہے تو پھر حاکموں کے خلاف بے وقت جہاد کرنے کی ضرورت نہیں جیسا کہ جنوب کے مقتدر عالم ومشہور صاحب قلم، شیخ طریقت ورہبرِ راہ حقیقت حضرت مولانا سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری معروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ نے اپنے مکتوب مؤرخہ ۲۶ دسمبر ۱۸۳۹ء میں تحریر فرمایا کہ " اہل اسلام کی شرع میں جو حاکماں کہ مانع بانگ وصلوٰۃ اور احکام شرعی نہیں ہیں، پس اس صورت میں کیوں کر کوئی خلاف شرع جہاد کی تجویز دے گا"[۲]

حکام وقت کے خلاف جہاد ان حالات میں کس طرح کیا جاسکتا ہے جب کہ امت مسلمہ کی قوتِ عمل احساس کمتری کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہو اور مسلمانوں کے پاس نہ کوئی منظم فوج ہو اور نہ ان میں جنگی استعداد وصلاحیت

موجود ہو، بایں ہمہ بے سروسامانی، چاق و چوبند کیل کانٹوں سے لیس چالاک، دشمن کے مقابلے میں اقدام کرنا خودکشی کے مترادف نہیں تو پھر کیا ہے ؟ ! ـــ

انہیں حالات کے تحت علمائے جنوب نے انگریزوں کے خلاف نہ تو کوئی فتویٰ صادر کیا اور نہ ان کے انتظامی امور میں خواہ مخواہ مداخلت کو پسند کیا، علماء کے اس حکیمانہ رویہ کا خوش گوار اثر یہ مرتب ہوا کہ انگریز حکمرانوں نے یہاں کے اکابر فضلاء کی عزت اور بلند پایہ صوفیاء کی خدمت اپنے پیش رو نوابوں اور راجاؤں کی طرح کھلے ذہن سے کرنے لگے تھے اور علمائے کرام نے بھی ان حکمرانوں کے خیرسگالی اقدامات کو بطیب خاطر قبول فرمالیا تھا اس طرح جب باہم موافقت کے تانے بانے استوار ہو گئے تو اہل علم و صاحب کمال اشخاص کو منصب و اقتدار بخشا گیا، خطابات دئے اور جاگیریں عطا کی گئیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علمائے جنوب کی طرح شمال میں بھی بعض راسخ العقیدہ مستند و جید علماء نے انگریزوں سے جہاد کرنے کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔ بقول حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمتہ علیہ " اسی قصبۂ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب ؒ کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے، چوں کہ تینوں حضرات پیر بھائی اور ایک ہی مقدس ہستی میاں جی صاحب کے دریوزہ گر تھے۔ اس لئے آپس میں میل جول اتحاد و اتفاق بڑے پیمانے پر رہتا تھا، مگر مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے . . . . اس بناء پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات (یعنی حضرت حافظ ضامن صاحب ؒ اور حضرت امداد اللہ مہاجر مکی ؒ) مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے بد قسمتی سے مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں اس اختلاف

کی بناء پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا قاسم صاحب کو انکے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا جب ہر دو حضرات پہونچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی، حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا۔ (چوں کہ وہ چچا پیر تھے اس لئے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا) آپ ان دشمنانِ دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے؟ توانہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سر و سامان ہیں[3]۔"

بہر حال اس مقام پر جنوب کے بعض نامور علماء اور صاحب دل صوفیاء کے اسمائے گرامی بطور نمونہ پیش کئے جا رہے ہیں، جن کے روابط انگریزوں کے ساتھ کسی نہ کسی سطح پر موجود تھے:—

۱۔ حضرت مولانا قاضی ارتضا علی خان بہادر خوشنود گوپاموی (۱۲۷۰ — ۱۱۹۸ھ)

آپ مرکز علم و فضل شہر مدراس کے بلند پایہ عالم، صوفی اور استاذ العلماء تھے، آپ نے مختلف علوم و فنون میں قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے بعض آج بھی مدارس عربیہ میں پڑھائی جاتی ہیں، آپ کو حکومت برطانیہ نے ۱۲۴۴ھ میں قاضی القضاۃ (chief Justice) کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا تھا[4]۔

۲۔ حضرت مولانا مولوی عبد الوہاب مدار الامراء بہادر نائطی (۱۲۸۵ — ۱۲۰۸ھ)

آپ شہر مدراس کے جید عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے، آپ نے حکومت برطانیہ کے سکریٹری سر چارلس اوڈ (SIR CHARLES WOOD) کو بزبان فارسی ایک مکتوب تحریر کیا تھا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت انہیں وہ تمام مراعات و حقوق عطا کرے۔ جو نواب غلام غوث خاں بہادر المتوفی ۱۲۷۲ھ کے دور میں جاری کئے گئے تھے[5]۔

۳۔ حضرت مولانا مولوی محمد صبغۃ اللہ قاضی بدرالدولۃ نائطی (۱۲۸۰ ـ ۱۲۱۱ھ):-
آپ صوبۂ مدراس کے مشہور عالم و فاضل تھے، آپ نے فارسی و عربی میں بہت ساری کتابیں تصنیف کیں۔ آپ انگریزوں کے دورِ اقتدار میں منصبِ قضا پر ۱۲۳۹ھ سے ۱۲۷۳ھ تک متمکن رہے۔ انگریز حاکم ایڈورڈ بال فور (EDWARD BAL FOUR) کے دور میں آپ شہر مدراس کے مشہور تعلیمی ادارہ "مدرسۂ اعظم" کی مجلس شوریٰ کے صدر مقرر کیے گئے تھے[6]۔

۴۔ قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین حضرت مولانا سید شاہ محی الدین عبداللطیف قادری معروف بہ قطب ویلور (۱۲۸۹ھ ـ ۱۲۰۷ھ):-
آپ خانوادۂ اقطابِ ویلور کے سلسلۃ الذہب کی مضبوط و اہم کڑی ہیں۔ سارا جنوبی ہند آپ کی قدر و منزلت، علم و فضل اور مجددیت و للّٰہیت کا معترف ہی نہیں بلکہ شیدائی رہے۔ آپ نے انگریزی زبان سیکھ کر ملکۂ برطانیہ وکٹوریہ (VICTORIA - QUEEN) اور دیگر انگریز حکمرانوں کو انہیں کی زبان میں مفصل خط تحریر کرتے ہوئے دینِ اسلام کی دعوت دی تھی[7] ۔ آپ نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۹؍ شوال ۱۲۵۵ھ مطابق ۲۶؍ دسمبر ۱۸۳۹ء میں حکومت برطانیہ کے حق میں جو دعائیہ کلمات تحریر بائے تھے۔ وہ اس طرح ہیں۔ "زیادہ ایام داد گستری اور رعایا پروری کے دراز ہو وے"۔ کرنل ٹیلر نے آپ کی خانقاہ میں ایک کنواں کھدوانے اور مسافر خانے کا چبوترا بنوانے کا حکم دیا تھا۔ جس کا ذکر آپ نے مذکورہ خط میں کیا ہے[8]۔
ایک اور مکتوب مورخہ ۴؍ دسمبر ۱۸۳۹ء میں بھی اسی طرح کے الفاظِ دعائیہ "زیادہ حکومت اور عدالت روز افزوں ہو وے" کا آپ نے استعمال کیا ہے۔ ضلع چیتور کے کلکٹر" اوکل بے صاحب" کے نام تحریر کردہ خط مورخہ ۲۷۔

جمادی الاول ۱۲۵۵ھ میں "ایام داد گستری و رعایا پروری دراز باد" کے کلمات خیر موجود ہیں۔

۵۔ حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری (۱۲۲۵ھ — ۱۲۹۹ھ) :-
آپ حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ کے خلف صالح، جانشین اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، آپ ہی کے دور میں آپ کے جد اعلیٰ حضرت قربی (۱۱۸۲ — ۱۱۱۶ھ) کے ہاتھوں قائم شدہ خانقاہی مدرسۂ دار العلوم لطیفیہ کی تشکیل جدید کی گئی تھی۔ آپ کی بلند قامت شخصیت اور علمی کارناموں سے متأثر ہو کر وائسرائے ہند نے ۱۲۹۴ھ میں آپ کو "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا تھا۔[۱۰]

۶۔ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی شاہ عبد الوہاب صاحب قادری ویلوری قدس سرہٗ (۱۲۴۷ — ۱۳۳۷) :-
آپ حضرت قطب ویلور رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل اور ام المدراس مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کے بانی ہیں، آپ نے ویلور میں جو علمی شجرۂ طوبیٰ لگایا تھا اس کی شاخیں نہ صرف ٹمل ناڈو، کیرلا، کرناٹکا اور آندھرا بلکہ جنوب بعید کے تمام ممالک مثلاً سیلون، ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ وغیرہ میں بھی کافی دور دور تک پھیلی ہیں۔ آپ کے وسیع علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت برطانیہ نے مورخہ ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۷ء کو "شمس العلماء" کے خطاب سے آپ کو نواز کر اپنی علم دوستی و علماء پروری کا ثبوت دیا تھا۔[۱۱]

۷۔ خاں بہادر شاہ ضیاء الدین محمد قادری المتوفی ۱۹۴۱ء :-
آپ اعلیٰحضرت بانی باقیات کے خلف صالح اور خلیفہ و مجاز تھے، اعلیٰ حضرت شاہ عبد الوہاب قادریؒ کی وفات کے بعد مدرسۂ باقیات کے آپ ناظر و مہتمم (PRINCIPAL) مقرر

کئے گئے تھے۔ آپ انجمنِ تعلیمی وانمباڑی ضلع شمالی آرکاٹ کے صدر نشین اور دیگر کئی اداروں کے سرپرست و روح و رواں تھے۔ آپ نے انگریزوں کے خلاف "ترک موالات" کی تحریک چلانے کے سلسلہ میں سخت مخالفت کی تھی، آپ نے "قومی رپورٹ مدراس" کے مدیر مولانا محمد عبد المجید شرر مدراسی کو ایک طویل مراسلہ ارسال کرتے ہوئے رقم فرمایا کہ "اصل مسئلہ یہ ہے کہ موالات علیحدہ شئی ہے اور تعاون علحدہ چیز ہے، غلط مجت نہ کرنا چاہئے "گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی" موالات لمشرکین و اہل کتاب، مسلمان فاجر، کسی سے بھی جائز نہیں بخلاف تعاون کے، ان سب لوگوں سے جائز ہے[۱۲]" آگے ایک اور مقام پہ ارشاد کیا کہ "کافروں کا مال مباح ہے لینا مسلم کو جس طریقے سے بھی ہو بجز غبن کے، اس ترک پہ کسی کو مجبور کرنا، اس کے زمانے پر اس سے ترک موالات کرنا اس کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ آرائی اور قدیم عداوتیں ظاہر کرنے کے لئے مواقع دینا، خلاف شرع بھی ہے اور خلاف عقل بھی[۱۳]۔"

آپ کے دورِ نظارت میں مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے نئے دار الاقامہ بیادگار اعلحضرت شاہ عبد الوہاب صاحب قادریؒ کا افتتاح ۱۹۲۵ء میں صوبۂ مدراس کے گورنر لارڈ وائی کونٹ گوشن (LORD VISCOOT GHOSION) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

تحریک ترک موالات کی مخالفت نہ صرف علمائے جنوب نے کی بلکہ شمالی ہند میں بھی بعض اہم شخصیتیں جو علم و فضل میں کافی ممتاز تھیں، اس تحریک کی مخالفت میں صدا بلند کی تھیں مولانا سر سید احمد خانؒ المتوفی ۱۸۹۸ء اور علامہ سر محمد اقبالؒ المتوفی ۱۹۳۸ء کی انگریز دوستی ان دونوں حضرات کے سرِنام "سر" کے خطاب سے ظاہر ہے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے نامور عالم دین، خطیب

وقت، صاحبِ دل امیر کبیر، علمائے سلف" اور سیرۃ الصدیق" جیسی بہت ساری گراں قدر و معیاری کتابوں کے مصنف، ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے ایک نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ المتوفی ۱۹۵۰ء جو بانی باقیات صالحات شاہ عبدالوہاب قادری المتوفی ۱۹۱۹ء کے سلسلۂ نقشبندیہ میں پیر بھائی ہوتے ہیں۔ (دونوں بزرگ حضرت قیوم دوراں مولانا فضل رحمٰن صدیقی مجددی گنج مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز المتوفی ۱۳۱۳ھ سے فیضیافتہ ہیں[۱۳]) اپنی علیگڈھ کی تقریر جس کی تفصیل محترم ریاض الرحمٰن شروانی نے اپنے مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب صدر یار جنگ" میں اس طرح ترقیم کی ہے" عدم تعاون کی تحریک کے اثرات علیگڈھ کالج میں بھی پہونچے اور کالج کے بعض سپوتوں نے جذبۂ آزادی کی گرمی اپنے سینوں میں محسوس کی، قومی رہنماؤں نے جن میں مہاتما گاندھی، مولانا محمود حسن، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد پیش پیش تھے، انہیں اس طرف دعوت دی۔ نواب صاحب (نواب صدر یار جنگ) طبعاً سیاسی ہنگاموں کو ناپسند کرتے تھے اور ان کی ایمانداری سے رائے تھی کہ اس تحریک میں شرکت کالج کے مفاد میں نہیں تھی، اس لئے انہوں نے اس کی مخالفت فرمائی۔ "اسٹریچی ہال" میں جلسہ ہوا جس میں مولانا محمد علی نے تحریک میں شرکت کی حمایت میں اور نواب صاحب نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں[۱۵]"

انگریز حکمرانوں کے ساتھ علمائے جنوب کے تعلقات و روابط کی عمارت صرف اسلامی اخلاق و رواداری کی بنیاد پر قائم تھی تاکہ اشاعت اسلام کے دروازے سرکاری قدغن کی وجہ سے بند نہ ہونے پائیں، تبلیغ دین کے اس عظیم مقصد کے لئے علمائے کرام کی اتنی سی مصلحت کوشی و دوراندیشی ان کے

اپنے نکتۂ نظر سے صحیح اور مناسب تھی ۔ اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ جنوبی ہند میں حکومت برطانیہ کے اقتدار سے لے کر آج کی جمہوریہ کے ادوار تک غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کا کام کبھی نہیں رکا، بلکہ بفضلہ تعالیٰ ہر روز جنوب کے کسی نہ کسی شہر میں بالخصوص صوبۂ ٹمل ناڈو کے کسی نہ کسی دیہات میں کوئی نہ کوئی خدا کا بندہ مشرف باسلام ہوتا رہتا ہے یہ انہیں علمائے کرام کے طریقۂ کار کے اثرات اور ان کے اخلاص وللہیت کے ثمرات کا بین ثبوت ہے۔ "ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء"۔

یہاں اس فرق کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ علمائے جنوب نے عیسائی حکمرانوں کا ساتھ دیا تھا نہ کہ مذہبِ عیسائیت کا، اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب بعض اہل علم علمائے جنوب پر خواہ مخواہ تنقید کر بیٹھتے ہیں۔ حالاں کہ بات وہ نہیں ہے جو انہوں نے اپنی دانست میں سمجھی تھی بلکہ سچ دراصل یہی ہے کہ علمائے جنوب نے عیسائیوں کی کسی بھی مشینری ہو یا تبلیغِ عیسائیت کی کوئی بھی تحریک ہو اس کا سختی سے مقابلہ کیا تھا، انہوں نے یہ مشکل کام اپنی خدا داد صلاحیت اور وعظ و تقریر کے ذریعہ بآسانی کر دکھایا تھا، بعض خصوصی حالات کے تحت ردعیسائیت میں تصنیف کردہ کتابوں کی اشاعت کا بیڑا بھی اٹھایا گیا، چنانچہ اعلیٰ حضرت بانی باقیات کے شفیق استاذ ردِ عیسائیت کے ماہر مناظر، پایۂ حرمین حضرت علامہ رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہٗ بانی مدرسۂ صولتیہ مکہ مکرمہ کی مایہ ناز ضخیم تصنیف "ازالۃ الشکوک" علمی دنیا میں پہلی بار خان بہادر مولانا شاہ ضیاء الدین محمد قادریؒ کے زیر اہتمام ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوئی تھی۔[16]

بہرحال انگریز حکمرانوں نے جنوب کے اصحاب علم و فضل کی ہمیشہ عزت افزائی و قدردانی کی، وہ زیرک سیاست داں تھے لہٰذا حتی المقدور

ان برگزیدہ ہستیوں کی ایذا رسانی سے احتراز کرتے رہے جو مرجعِ خاص وعام کہلاتی تھیں، انگریزوں نے کبھی ان پر ظلم وزیادتی کو روا نہیں رکھا۔ سلطنتِ برطانیہ کی اس حکمتِ عملی و دوراندیشی کے باوجود شہر ویلور میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے مسلمانانِ جنوب مضطرب و پریشان ہوگئے اور انگریزوں کی نیک نامی وحسنِ انتظام کو بہت دھکا لگا۔ اس سانحہ نے ان کی ساکھ کو کافی نقصان پہونچایا، بالآخر حقیقت حال کے انکشاف کے بعد ملکۂ وکٹوریہ کو اس تعلق سے معافی مانگنی اور معذرت خواہی کرنی پڑی[14]
یہ تاریخی حادثہ حضرت قطب ویلورؒ کی اسیری اور بعدازاں باعزت رہائی کی صورت میں ۱۲۵۵ھ میں پیش آیا تھا۔ جو دراصل انتہائی غلط فہمی کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا، اس جانکاہ حادثہ کے خدوخال کو واضح کرنے اور اس کے حقیقی پس منظر کو تلاش کرنے میں حضرت قطب ویلورؒ کے تمام تذکرہ نگار صد فی صد ناکام رہے ہیں۔ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ حضرت قطب ویلورؒ کے خلیفۂ ارشد، آپ کے اولین تذکرہ نگار اور کثیر التصانیف شخصیت حضرت مولانا مولوی شاہ عبدالحی واعظ احقرؔ بنگلوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی "مطلع النور" مطبوعہ ۱۲۹۱ھ میں اس حادثہ کے پس منظر کی کامل و مکمل تصویر کشی نہیں کی، حضرت شاہ عبدالحی قبلہ نے حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ کی اسیری کو معاندین وحاسدین کی افترا پردازی، مال ودولت کی ہوس رانی اور منصب و جاہ طلبی کی کارستانی قرار دیا ہے[15]۔ مؤلفِ خانوادۂ اقطاب ویلور قدس اللہ اسرارہم "مولانا زکریا ادیب خاور راجوی" اپنے مختصر کتابچہ مطبوعہ ۱۹۵۸ء میں اس اہم واقعہ کو نظر انداز ہی کردیا ہے۔
مولانا مولوی محمد طیب الدین اشرفی سابق استاذ دار العلوم لطیفہ حضرت مکان ویلور نے اپنی گرانقدر تالیف "انوار اقطاب ویلور" مطبوعہ

۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں اور "خانقاہِ مکانِ حضرت قطب ویلور (انگریزی) کے فاضل مؤلف جناب محترم شیخ شاہ عبدالرحیم قادری کاکی نے اپنی کتاب مطبوعہ ۱۹۸۷ء میں مثنوی "مطلع النور" کے تفصیلات ہی کا اختصار کا جامہ پہنایا ہے۔

"مجدد جنوبی ہند قطب ویلور رحمت اللہ علیہ" کے لائق و قابل مؤلف مولانا حافظ بشیر الحق قریشی استاذ دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان ویلور نے اپنی کتاب مطبوعہ ۱۹۸۹ء میں اس اندوہ ناک واقعے کے اسباب کے تحت شر پسندوں کی حکومت سے شکایت اور ملکۂ وکٹوریہ کے نام اسلام کی دعوت کو بنیاد بنایا ہے[19]۔

مولانا محمد یوسف کوکن عمری مرحوم نے اپنی گرانقدر تالیف "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک" مطبوعہ ۱۹۷۴ء میں اس واقعے کے ضمن میں یوں رقم کیا کہ ملکہ وکٹوریہ کو دعوتِ اسلام دینے کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہو کر حضرت قطب ویلورؒ کو اسیر بنا گیا تھا[20]۔

الغرض مذکورہ تمام تذکروں میں اس تکلیف دہ حادثے کے متعلق تفصیلات کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں تذکرہ نگاروں میں سے کوئی بھی اس جراَتِ بیجا کے پس پشت کارفرما عوامل کا صحیح جائزہ نہیں لے سکا۔ ورنہ کیا بات تھی کہ اس قدر برگزیدہ و بزرگ شخصیت اور بے حد رسوخ رکھنے والی گرامی قدر ذات کو چند شر پسندوں اور کچھ حاسدوں کے بہتان و عناد کے سبب اور ملکہ وکٹوریہ کے نام اسلام کا پیغام ارسال کرنے کے خیر سگالی جذبہ پر گرفتار کرنے کا غیر معمولی اقدام بعید از قیاس ہے۔

بہرحال یہاں اسیر حادثۂ کرب و بلا اور آزمائشِ خداوندی میں مبتلا ذاتِ والا حضرت قطب ویلورؒ کے طویل مکتوب کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے صحیح

حالات و واقعات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے مگر اس سے بیشتر مذکورہ حادثے کے پس منظر کی صحیح عکاسی اور اس واقعے کے داعیہ کو متعین کرنے کے لیے ۱۸۰۶ء میں شہر ویلور کے قلعہ میں رونما ہونے والی بغاوت کا مختصر تاریخی مطالعہ بہت ضروری ہے۔

حضرت ٹیپو سلطان رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت (۱۷۹۹ء) کے سات سال بعد اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے تقریباً نصف صدی قبل ہی بتاریخ ۱۰ر جولائی ۱۸۰۶ء کو ویلور کے تاریخی قلعہ میں زبردست بغاوت رونما ہوئی تھی، مگر افسوس کہ یہ بغاوت خود اپنوں کی غلطی اور غیر منظم منصوبہ بندی کی وجہ سے بری طرح ناکام ہو گئی تھی۔

اس بغاوت کی پاداش میں تقریباً چار ہزار ہندوستانی سپاہی انگریزوں کے ہاتھوں جاں بحق ہو گئے۔ اس ناکامی کا خمیازہ قلعۂ ویلور میں نظر بند حضرت ٹیپو سلطانؒ کے خویش و اقارب کو بھگتنا پڑا۔ حاکمانِ وقت نے شہزادگانِ سلطان اور بعض اہل خانہ کو ۲۰ر جنوری ۱۸۰۷ء کو شہر ویلور (علاقۂ مدراس) سے دور بہت دور شہر کلکتہ روانہ کر دیا تھا اور نواب حیدر علی مرحوم کی اہلیہ محترمہ بخشی بیگم (ہمشیرۂ نواب عبدالحلیم خاں میاں والیٔ کڑپہ) حضرت ٹیپو سلطان کی اہلیہ، دختروں اور دامادوں کو ویلور ہی میں رکھ چھوڑا تھا۔[۲]

چوں کہ حضرت قطب ویلورؒ کی اسیری سے ٹھیک تینتیس (۳۳) سال بیشتر ویلور میں وسیع پیمانے پر بغاوت ہو چکی تھی اس بغاوت کو فرو کرنے میں ذرا سی تاخیر یا غفلت ہو جاتی تو انگریزوں کے ہاتھ سے عنانِ حکومت چھوٹ جاتی، اسی لیے بغاوت کی ناکامی کے بعد سے انگریز حاکم و منظم بالکل چوکنا ہو گئے تھے، کسی بھی چھوٹے بڑے واقعے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جب شر پسندوں نے یہ پر کی اڑائی کہ "حضرت قطب ویلورؒ انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے

مسلمانوں کو اکسا رہے ہیں" تو حاکموں کے کان کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فوری اقدام کرتے ہوئے حضرت قطب ویلورؒ کو حراست میں لے لیا اور چتور لے گئے جو اس ضلع کا صدر مقام تھا، تا کہ کسی بھی طرح کے خلفشار کا پہلے سدِّ باب ہو جائے تو پھر بعد تحقیق جو بھی صورتِ حال ابھر کر سامنے آئیگی، اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ چوں کہ انگریز دودھ کے جلے تھے۔ اس لئے چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پینا چاہتے تھے۔ راقم الحروف کی رائے میں آپ کی اسیری کے پسِ منظر کا صحیح نقشہ یہی تھا۔

بہر حال حضرت قطب ویلورؒ نے اسپیشل کمشنر لوئن صاحب کو بتاریخ ۱۶ر شوال ۱۲۵۵ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۸۳۹ء ایک مکتوب روانہ کیا تھا، جس میں اس واقعہ کی تفصیل تحریر کی تھی، ذیل میں اس کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے :-

آج سے تقریباً آٹھ ماہ قبل ایک مسافر مسمّٰی خدمت علی مع اہلیہ احاطۂ حضرت مرکان میں فروکش ہوا۔ یہ خبر کمسیری آدری صاحب تک پہنچی تو انہوں نے کسی خاص مقصد کے تحت خدمت علی کو اپنے ہاں طلب کیا، مگر وہ حاضری میں لیت و لعل کرنے لگا تو مذکورہ کمسیری صاحب نے حضرت قطب ویلورؒ کو حکم دیا کہ "خدمت علی ایک مشتبہ شخص ہے جو آپ کے مکان کے احاطہ میں ٹھہرا ہوا ہے لہذا آپ اسے اپنے ساتھ لے کر کچہری حاضر ہو جائیں"۔ حضرت قصب ویلورؒ کمسیری صاحب کی طلبی کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ "اس فقیر کے بزرگاں اور یہ فقیر کا آج تک کسی مقدمات میں کچہری وغیرہ کو جانے کا دستور نہیں ہے اور حکام پیشیں جو تو ابین تھے ان کے ہاں بھی کبھی نہیں گئے ہیں، اس واسطے یہ فقیر بھی مدام گوشہ نشینی اختیار کر کبریا دالٰہی میں مشغول رہتا ہے اور خدمت علی کون ہے سو تو اوسکو میں جانتا ہوں نہ اتارا ہوں، اور فقیر کسی طرح کی حکومت نہیں رکھتا ہے کہ خدمت علی

کی نگہبانی کرے اور فقیر بھی اور فقیر کا مکان بھی آپ کی سرکار کی حکومت کے ماتحت ہیں، جس طرح چاہے اوس طرح خدمت علی کو پکڑ کر منگوالینا[52]"

دوسرے دن کو توال عبدالقادر کے ذریعے خدمت علی کو گرفتار کیا گیا اور اس کو ضلع کلکٹر اوکل بے صاحب کے حوالے کر دیا گیا۔ کلکٹر نے اس سے پوچھ تاچھ کرنے کے بعد بے قصور جان کر رہا کر دیا۔

چوں کہ آپ نے کمسیری صاحب کی طلبی پر معذرت کر دی تھی اس لئے اس کے دل میں آپ کے تعلق سے گرانی پیدا ہو گئی تھی، اس بات کا ذکر کمسیری کچہری کے علاقہ دار منشی لچھمن راؤ نے آپ کے بعض مخالفوں کے سامنے کیا، ان دشمنوں نے آپ سے انتقام لینے کا یہی مناسب وقت سمجھا، لہذا لچھمن راؤ کے توسط سے حسن زماں خان، جعفر بیگ اور قادر محی الدین کو جو آپ سے خدا واسطے کا بیر رکھتے تھے، اپنا ہمنوا بنالیا۔ بعد ازاں سب سے مل کر کمسیری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی کہ حضرت قبلہ انگریز حکومت کے خلاف جہاد کی ترغیب دے رہے ہیں، چوں کہ کمسیری آپ کے تعلق سے دل میں کدورت رکھے ہوئے تھا، اس لئے مذکورہ شکایت کنندگاں پر یقین کرتے ہوئے آپ کے خلاف بلا تحقیق رپٹ لکھ بھجوادیا، حکومت جہاد کا نام سنتے ہی بے چین ہو گئی، فوری آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا اور چتور کے کلکٹر کے حوالے آپ کا مقدمہ کر دیا گیا۔ آپ نے تقریباً پچاس[5] دن اسیری میں کاٹے[53]۔ پہلے ہی روز آپ سے یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ جیل کی تاریک کوٹھری میں من جانب اللہ تیز روشنی پھیل گئی، یہ دیکھ کر جیل کا وارڈن اور دیگر حکام بہت متاثر ہوئے، آپ کی عزت و احترام کرنے لگے۔ بعد ازاں آپ کے مخالف مقدمہ ہار گئے تو آپ کو حکومت نے باعزت بری کرتے ہوئے اپنے مخالفین پر ہتک عزت کا دعویٰ داخل کرنے کی اجازت دیدی مگر آپ

نے تمام دشمنوں کو معاف کردیا[24]۔ اس نادر واقعہ کا بھی انگریزوں پر بہت اثر ہوا اور آپ کی عقیدت ان کے سینوں میں اور بڑھ گئی ، اس طرح خدائے تعالیٰ کی اس آزمائش کا دور ختم ہوگیا۔

الغرض علمائے جنوب نے سخت ترین ابتلاء کے وقت بھی اپنے اخلاق کریمانہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جس کی وجہ سے دشمن بھی دوست بلکہ شیدائی بنتا گیا اس طرح اشاعت اسلام اور تبلیغ دین کی راہیں قطعہ جنوب میں کھلتی چلی گئیں ، جس کے اثرات یہاں کی آب و ہوا میں آج بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات

1ے "الجمیعۃ" ویکلی دہلی ۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء صفحہ ۳ بحوالہ "الرسالۃ" جون ۱۹۹۱ء شمارہ ۱۷۵ صفحہ ۸

۲ے غیر مطبوعہ مکتوب حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ العزیز بنام اسپیشل کمشنر لوائن صاحب

۳ے "نقش حیات" جلد دوم مطبوعہ ۱۹۵۲ء صفحہ ۴۲

۴ے "عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک" مطبوعہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۲۷ از افضل العلماء مولانا یوسف کوکن عمری

۵ے " " " " صفحہ ۲۸۴

۶ے " " " " صفحہ ۲۸۸

۷ے "مجدد جنوبی ہند حضرت قطب ویلورؒ" مطبوعہ ۱۹۸۹ء صفحہ ۲۵ از مولوی حافظ بشیر الحق قریشی قادری لطیفی

۸ے غیر مطبوعہ مکتوب حضرت قطب ویلورؒ مورخہ ۱۹ شوال ۱۲۵۵ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۳۹ء۔

۹ے غیر مطبوعہ مکتوب حضرت قطب ویلورؒ مورخہ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۵۵ھ بنام کلکٹر اوکل بے،

۱۰ے "اللطیف" خاص نمبر بیادگار اقطاب ویلور قدس اللہ اسرارہم مطبوعہ ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء شمارہ نمبر ۲۵ صفحہ ۱۱۵

۱۱ے "عربک پرشین ان کرناٹک" مطبوعہ ۱۹۷۴ء صفحہ ۵۲۹ از مولانا محمد یوسف کوکن عمری

۱۲ے "خلافت کی حمایت میں مخالفوں سے ترک موالات" مطبوعہ ۱۳۳۹ھ صفحہ ۱۰ منجانب خلافت کمیٹی، وانمباڑی۔

۱۳ے خلافت کی حمایت میں مخالفوں سے ترک موالات" مطبوعہ ۱۳۳۹ھ صفحہ ۱۱ منجانب خلافت کمیٹی وانمباڑی، مدراس۔

۱۴ے پرانے چراغ حصہ دوم صفحہ ۳۸ از حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور "مسلک باقیات" صفحہ ۳۱ از راقم الحروف

۱۵ے مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے" مطبوعہ ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۸۸ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

۱۶ے "ازالۃ الشکوک"، حصہ دوم صفحہ ۵۰۸ از حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس سرہ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ

۱۷ے "اللطیف" سالنامہ خاص نمبر شمارہ ۲۵ مورخہ ۱۰ رماہ شعبان ۱۴۰۴ھ صفحہ ۸۳ از حضرت مکان ویلورؒ

۱۸ے مثنوی مطلع النور" صفحہ ۲۶ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ از حضرت مولانا شاہ عبدالحی واعظ بنگلوری۔

۱۹ے "مجدد مینوب حضرت قطب ویلورؒ" صفحہ ۲۵ مطبوعہ ۱۹۸۹ء از مولوی

حافظ بشیر الحق قریشی لطیفی

ن۲۰ عربک اینڈ پرشین اِن کرناٹک (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۷۲ء صفحہ ۵۰۳ از مولانا محمد یوسف کوکن عمری

ن۲۱ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی "بغاوت ویلور" مرقومہ پروفیسر میر محمود حسین صاحب میسوری مطبوعہ روزنامہ سالار بنگلور مورخہ ۲۸، ۲ ۱۹۸۹ء یکم، مارچ اور ۳، مارچ ۸۹ء،

ن۲۲ غیر مطبوعہ مکتوب حضرت قطب ویلور مورخہ ۲۳، دسمبر ۱۸۳۹ء بنام لوئن صاحب

ن۲۳ "مثنوی مطلع النور" صفحہ ۳۰ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ از حضرت شاہ عبدالحی واعظ احقر بنگلوری رح

ن۲۴ " صفحہ ۳۲ " " "

خطوط نگاری

خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے، یہی نصف ملاقات بعض اوقات نصفیہ ملاقات بن جاتی ہے یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ خط افادتی و اشاعتی اغراض و مقاصد سے ہٹ کر صرف جذبۂ دلی و بے ساختگی کے تحت تحریر کیا گیا ہو اور خود نمائی اور ریاکاری کی تیرگی سے قرطاس و قلم اس قدر پاک وصاف ہوں کہ اس کے حرف حرف سے دوستی و راستی کی خوشبو مہک اٹھے۔

مکتوب درحقیقت کاتب کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے "کاتب ازل" نے جب پہلے "قلم" کی تخلیق کی پھر اس سے کہا کہ لکھ! تو "قلم" نے "لوحِ محفوظ" پر وہی لکھا جو تقاضائے "کُن" تھا، اس لئے صفحۂ کائنات کے ہر حرف بلکہ ہر نقطے سے "کاتب ازل" کے نورِ کبریائی کا ظہور ہوتا ہے۔ جس سے دیدۂ بینا ورطۂ حیرت میں سرگرداں رہتا ہے۔

خط اگر افادۂ عام کے خیال سے زیب رقم کیا گیا ہو تو اس کی حیثیت

مقالہ و مضمون کی سی ہو جائے گی۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ خطوط جو "غبارِ خاطر" میں شامل ہیں۔ جب خطوط میں احتیاط و احتساب کا احساس دامن گیر رہے تو بے خطر آتشِ شوق میں کود پڑنے کی ادائے دل ربائی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ بقولِ مولانا عبدالماجد دریا بادی " دستوں، عزیزوں، رفیقوں کے نام جو خط عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور روزمرہ پیش آنے والے حالات و واقعات کے ماتحت ان کا رنگ ہی دوسرا ہوتا ہے، تصنیف و تالیف کے فکر و اہتمام سے انہیں کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی۔ نہ وہ سوچ بچار کر کے لکھے جاتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی دخل عبارت آرائی کو ہوتا ہے نہ ان پر نوبت نظرِ ثانی کی آتی ہے بس جس طرح انسان بے تکلّف اپنے بیوی بچوں، بھائی بندوں، دوستوں رفیقوں سے بات چیت کرتا ہے، یہ نجی خط بھی اس طرح سادہ زبان میں اور قلم برداشتہ لکھ دیئے جاتے ہیں" (دیباچہ "مکتوباتِ سلیمانی" جلد دوم ص ۳ مطبوعہ ۱۹۶۷ء شاہی پریس لکھنؤ)

بہر حال مشہور خطیبوں اور نامور ادیبوں کی شعلہ نوائی و انشاء پردازی کا لطف ان کے اپنے ذاتی خطوط سے حاصل کرنے کی تمنّا بسا اوقات ناکام ہو جاتی ہے جیسا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی طرز نگارش ہے جو بہت دلکش، بہت پُر جوش اور خطیبانہ ہے" (ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت مرتبہ عبداللطیف اعظمی ص ۱۵ مطبوعہ ۱۹۶۷ء مکتبہ جامعہ دہلی) مگر اس کے برعکس ذاکر صاحب کے خطوط جو نجی اور ذاتی نوعیت کے ہیں۔ آپ کی وضع داری پر وقار شخصیت کے عکّاس ہیں۔

آپ کے خطوط میں نہ خطیبانہ جوش ہے نہ مناظرانہ رنگ۔ بس ایک گونہ شگفتگی و سنجیدگی اور مروّت و متانت کی جلوہ آرائی دامنِ دل کو کھینچے ہوئے ہے ہاں! وہ خطوط جو کسی استفسار کے جواب میں تحریر کئے ہیں جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالاعلیٰ

مودودی، مولانا سید شاہ سلیمان ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے خطوط ہیں جن میں وہی جوش استدلال اور اقرار وانکار کا جذبہ غالب نظر آتا ہے جو ان حضرات کی تصانیف کا خاصہ ہے۔

الغرض خانگی وذاتی مکاتیب کی نوعیت واہمیت دیگر اشاعتی وافادتی مکاتیب سے قدرے مختلف ہوتی ہے، اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مکتوب نگار کی زندگی کے خفیہ گوشے اور فکر وعمل کے پوشیدہ زاویئے روشن ومعطر ہو اٹھتے ہیں۔ بقول مولانا اسعد گیلانی "آدمی کے مکاتیب اس کے اندر کے انسان کو نہایت عمدگی سے بے نقاب کرتے ہیں۔ جس آسانی سے کوئی شخص مکاتیب میں اپنے دل ودماغ کو کھول کر رکھ دیتا ہے اتنی آسانی سے وہ اپنے دیگر مضامین، علم و ادب میں نہیں کھلتا، اس لئے کسی شخص کے پرائیویٹ مکاتیب اس کی ذات اور شخصیت کا بہترین آئینہ ہوتے ہیں جس میں اس کے دل ودماغ، جذبات وخیالات اور ذات کی مختلف جذئیات کو بڑی آسانی سے دیکھا، پرکھا اور پڑھا جاسکتا ہے" (ص ۳۰۸ "مولانا مودودی سے ملئے" مطبوعہ سنہ ۱۹۶۶ء مکتبہ تجلی دیوبند)

ذاتی مکاتیب اور شخصی نامہ جات کی انہیں خصوصیات کے مدنظر بعض اہل علم وفضل اپنی زندگی میں ذاتی خطوط کی اشاعت کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بھی، عین حیات اپنے ذاتی مکاتیب کی اشاعت و اظہار سے منع کر دیا تھا جیسا کہ آپ کے ایک خط سے جو حکیم نور الحق جاوید چامراج نگر (میسور) کے نام تحریر کیا گیا تھا اس بات کی وضاحت ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب لکھتے ہیں "البتہ خطوط کے معاملے میں میں سمجھتا ہوں کہ وہ شخصی دستاویزیں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی اشاعت سے کم سے کم لکھنے

والے کی زندگی میں احتراز کرنا چاہیئے۔ بعض لوگوں نے اس میں بڑی بے احتیاطی کی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ لکھنے والوں کے انتقال کے بعد بھی ایسے خط چھپے ہیں جس سے بعض زندہ لوگوں کو بہت دکھ پہونچا ہے" (مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۶۲ء مرسلہ از نئی دہلی)

بہر حال خطوط زندگی کے گوشۂ خمول کے غماز ہی نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات مکتوب نگار کے اطراف و اکناف کی آب و ہوا کے عکاس بھی ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر طیبہ خاتون :-

> "غالب نے ۱۸۵۷ء سے پہلے جو خطوط لکھے ان سے ان کی نجی زندگی کے علاوہ دہلی کی فضا کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خطوط حکومت کی دسترس سے دور تھے غالب نے ان دنوں گھر کی چہار دیواری میں بند رہنے کے باوجود دہلی کی گلی، کوچوں، قلعہ اور اس کی اطراف کی زندگی کو پوری سچائی اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔"
>
> (ص ۹۵ 'اردو میں ادبی نثر کی تاریخ'، ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)
> مصنفہ ڈاکٹر طیبہ خاتون، شعبہ اردو کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی سن اشاعت اپریل ۱۹۸۹ء)

حاصل کلام خطوط زندگی کا سرمایہ بھی ہیں اور تاریخی دستاویز بھی، مکتوبات کے ذریعے مکتوب نگار اپنے اکابر سے نہ صرف نصف ملاقات کا شرف حاصل کرتا ہے بلکہ اپنے خویش و اقارب سے خفیہ ملاقات کی لذت بھی پاتا ہے اسی لئے تو غالب کو خطوط نگاری بڑی پیاری لگتی تھی۔ دن بھر کا بیشتر حصہ انھوں نے اپنے دوست و احباب کو خطوط لکھنے کے لئے وقف کر رکھا تھا گویا اسی میں ان کے لئے تسکینِ دل و راحتِ جاں کا ساماں میسّر تھا

شہنشاہِ تشبیہات

جنابؔ ساغرؔ جیدی

عربی کے قدیم و عظیم ادیب ابو العباس مُبّرد (۸۲۶ ـــ ۸۹۸ھ) نے اپنی کتاب "الکامل" میں لکھا ہے کہ "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کلامِ عرب کا بیشتر حصہ "تشبیہ" سے وابستہ ہے تو اس کی بات کو بعید نہ خیال کرنا چاہیئے" راقم الحروف کی رائے میں تقریباً یہی قول محترم ساغرؔ جیدی صاحب کی شاعری پر بھی صادق آتا ہے کیوں کہ درحقیقت ساغرؔ صاحب کی شاعری "تشبیہ" ہی سے عبارت ہے۔

تشبیہ کی تعریف کرتے ہوئے عربی کے مشہور ادیب ابن ابی الاصبع نے کہا کہ "تشبیہ کسی مخفی امر کو واضح ترام کے ساتھ روشنی میں لانے کا نام ہے" تشبیہ جب شاعری میں درآتی ہے تو شاعر کے تحت الشعور میں پوشیدہ مشاہدات و تجربات کو لاشعور میں مخفی حادثات و سانحات کو تخلیقی نورانیت کے دائرے میں لاکر قاری سامع کے قلب و نظر پر براہِ راست منجلی کر دیتی ہے۔ جس سے ادراک و بصیرت کی راہیں وا ہو جاتی ہیں اور شعر میں جذبہ و تاثیر کی حدت نمو پاتی ہے ساغرؔ جیدی

صاحب کے ہاں بکثرت تشبیہات کا استعمال ہوا ہے آپ کے ذخیرۂ کلام میں سے مشتے نمونہ از خروارے بلا انتخاب چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں ؎

- سخی نما ہیں بخیل ہوتا — زمین میں خفتہ جھیل ہوتا
- رفتہ رفتہ ہم مساوی ہو گئے — بند مٹھی تھے ہتھیلی ہو گئے
- نرم کائی کے ان گھروندوں میں — کنبھیوں کا نہود اغلب ہے
- ساغر نا کاستہ علاقے میں — بنیا کا ادھار ہو گیا ہے کیا
- شیر خوار احمر کے لب پہ دودھ کا قطرہ — سرخ رنگ ٹہنی پہ بیضوی پرندہ ہے
- اطراف میرے شر ہے — دلدل میں نیلوفر ہے
- میں اور جہاں سے زیست کی بھیک — زاغوں سے کہاں عقاب مانگے
- نظر اپنے اخلاق پہ رائے اخی — کوئی وزن اوراق پہ رائے اخی
- ایک قطرہ بھی رک نہیں سکتا — زندگی توشگستہ چھاگل ہے
- موجودہ تضاد شاق ہے کیا — حنظل سے بھرا طباق ہے کیا
- آمادہ ہے شور و غل پہ مسافر — اخگر کے دہن میں ساق ہے کیا
- سرقۂ بالجبر کا موقع کہاں — کشتِ لق و دق ہوں میرے ہمدمو
- مجھ سے سرکش کے لئے سب کی دعا — کاسۂ خالی میں دریا آ گیا
- مجھے کوئی تہذیب ڈستی نہیں — میں اک سبز جنگل ہوں بستی نہیں
- اک بام اڑ نہیں سکتا — پتھر پہ کندہ طائر ہوں

جب کوئی شاعر اپنے اشعار میں نادر تشبیہات کا استعمال کرے گا تو وہ لا محالہ نئی لفظیات بالخصوص فارسی و عربی کے نامانوس الفاظ کا سہارا لے گا جن سے اردو دنیا ہنوز ناواقف ہے یہی معاملہ ساغر جیدی کے ساتھ ہے کہ

وہ حیرت انگیز طور پر عجیب و غریب تشبیہات سے اپنے افکار و خیالات کو چار چاند لگاتے ہیں جس سے کم مستعمل بلکہ غیر مستعمل لفظیات ان کی شاعری میں راہ پاتی ہیں۔ اسی سبب عام قاری تو کجا بسا اوقات بعض اہلِ علم کا سامعہ بھی نقلِ شعری کی فریاد کرنے لگتا ہے۔ اس تعلق سے ساغر جیدی صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

- نظر تتمہؔ مویشیوں پر / یہ سنکھیا کے غدیر ہیں سب
- ہر لطیقہ متزاید ہے / شہر شاداب ہوا ہے کیا
- ان عطب سے سفید چہروں پر / روشنائی کوئی چھڑک جائے
- مشتبہ ہی سہی زلوکِ ضعیف / سُرخ فہرست سے چپک جائے
- خیسک دانا قسام تک پہونچے / دریکتا اگر معاتب ہے
- فتیانِ شہور ہوں نہ ہوں روشن / قریہ میں گنوار ہو گیا کوئی
- ہمیان میں مادہ جنش / گھر لے گئی ایک قارعہ
- میں ناخنِ فتویٰ سے یکلخت مبرّا ہوں / یعنی کسی سالک کا صد عقیدہ اُڑ دیا ہوں

ہمارے بعض نقادوں نے مذکورہ خوبی یعنی نادر تشبیہات و غیر معروف لفظیات کو عیب سے تعبیر کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس عمل سے شاعری محدود حلقے کی مرہونِ منت ہو کے رہ جائیگی حالاں کہ یہ بات اس وقت صحیح ہو سکتی ہے جب کہ شاعری صرف نایاب الفاظ کا مرقع ہو جس میں فکر و خیال کی بو قلمونی اور جذبۂ جمال کی رنگینی کا گزر ہی نہ ہو۔ ہاں! اگر معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی نئی تشبیہات جدید افکار کی بھرپور شناخت کے لئے لائی گئی ہوں تو شاعری میں جدّت

جلوہ فگن ہوگی اور شہرت کے ہمراہ عظمت شاعری میں متمکن نظر آئیگی۔ یہیں سے شعر میں اثر آفرینی و تحریصِ فکر جنم لیتی ہے جس سے یک گونہ کیفیت قاری و سامع کے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مذکورہ خصوصیت حضرتِ غالبؔ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے، غالبؔ کی یہی مشکل پسندی اور فکر و خیال کی بلندی آپ کی عظمت و شہرت کی ضامن ہے (بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کا یہ قول کہ "غالبؔ کی شہرت و مقبولیت ان کے آسان کلام کی بنیاد پر ہے" راقم کی رائے میں در خورِ اعتناء نہیں ہے۔) ساغر جیدیؔ کے یہاں اثر انگیز و کیف افزا اشعار بے شمار ہیں جن میں سے مثال کے طور پر چند پیش کئے جارہے ہیں۔

- جرأتِ جبلت پہ کشت و خوں کی افشانی
  خوف اور جرأت کا باہمی نتیجہ ہے
- زمیں زہر پی کر اگلنے لگی ہے — ہر اک شاخ اُب کے ثمر سے ہے خائف
- رستم و حاکم سے ہمیں کیا غرض — خاک مقدم سے ہمیں کیا غرض
- ہم کتب غور فتور سے نکلے — سرخ عقرب سطور سے نکلے
- میں وہ زمستان کہ میرے قامت و قد میں
  گرم ہواؤں کا اقتباس ملے گا
- بدن گرم ہے روح نمناک ہے — فقیرانہ تعلیم اغلب نہیں
- تیری مکافات کا ردِ عمل ہے مگر — تحفۂ بے نام و ننگ ہم پہ مسلط نہ کر
- حدودِ شہر تقویٰ میں ابھی تک — مری آوارگی سینہ سپر ہے
- میری رگ و ریشہ پر ہیں نقشِ قدم ان کے
  میں جن کے وسیلے سے تحقیق میں آیا ہوں

- آج بھی نمناک ہے معصومیت　　　آج بھی فولاد پگھلتے نہیں
- وہ لوگ حسن و قبیح میں تفریق کیا کریں
جن کی شناخت آپ وہوا سے بندھی نہ ہو
- گونگوں کا اندھا فیصلہ　　　تاریخ پر احسان ہے
- کڑی ریت سے قطرہ قطرہ نچوڑ　　　گھٹا بن کے شہرت پہ برسی نہیں

ساغر جیدی کی شاعری کا کلیدی وصف ''تشبیہ'' ہے جیسا کہ ہمارے اس نظامِ شمسی میں آفتاب کے اردگرد تمام سیارے گھومتے رہتے ہیں اسی طرح ساغر صاحب کے اسی آفتابی وصف کے اطراف آپ کے شاعرانہ افکار و خیالات کے چھوٹے بڑے سیارے طواف کرتے دکھائی دیتے ہیں، اسی لئے آپ کے ہاں جو لطیف طنز کی کاٹ جابجا دکھائی دیتی ہے اسمیں بھی یہی عنصرِ تشبیہ اغلب و اکثر ہے ؎

- شہر رگی خون کا خدا حافظ　　　ہر معانق یہاں مہذب ہے
- عجلت کا شکار ہو گیا کوئی　　　بے جامہ فرار ہو گیا کوئی
میری طرف نہ دیکھ مہذب درندگی
میں جاذبِ نگاہ نہیں ہوں گنوار ہوں
- اب کے نہ آسکے گا　　　دل کا ٹھ کا ثمر ہے
- بچ پائیں نہ انتظار کی آنکھیں　　　اے زاغِ ہوس حساب ایسا کر
- قابلِ ترمیم نہیں جب کہ ہم　　　لذت موسم سے ہمیں کیا غرض
- مجھے کوئی تہذیب ڈستی نہیں　　　میں اک سبز جنگل ہوں بستی نہیں
- میں تیری کنجی آنکھ سے　　　دیکھا کروں بابُ السما

- معزز درندوں کی تقصیر کیا — اگر دشت و صحرا میں مکتب نہیں
- میری لغزش پہ تحسین وستائش — زمینِ سوختہ پر نیلوفر ہے
- تقدیس نہ پاسکا منافق علم — ساغر کا عظیم جہل جب تک ہے
- فلک بھی اک زمین ہے — منافقت حسین ہے

شاعری میں داخلیت وخارجیت کے مباحث اب فرسودہ ہوچکے ہیں. ساغر جیدی جیسے جدید شعراء نے ثابت کردیا کہ تخلیقی خلوص اور شاعرانہ سچائی جس فن پارے میں ہوگی وہی درحقیقت معتبر و موثر ہوگا۔ ساغر صاحب کے پاس داخلیت کی جلو میں خارجیت و عصری حسیت کے نادر نمونے بھی دامنِ دل کو کھینچتے نظر آتے ہیں ؎

- لہومیں بارود حل نہ ہوتی — اگر درندہ عدیل ہوتا
- جو اسم ہیں مختلف قبا میں — مری صدی کے ضمیر ہیں سب
- کہرام، کراہ، توک، سگ، شیپئر — دنیا ہے گلی گھناؤ نامنظر
- جنگ و جدل جرم و خطا حادثے — سبز زمینوں سے اگلتے نہیں
- فخر تھا ساغر کو جس کی دھول پر — خون کی زد میں وہ قصبہ آگیا
- سونا چاندی بٹورنے والے — جیب رکھتا نہیں کفن تیرا
- بارود ہے آگ ہے وطن ہے — شیروں کی گرفت میں ہرن ہے

ساغر جیدی چوں کہ ہندی اور تلگو کے جید عالم ہیں۔ اس لئے آپ کے ہاں مشاہدات و تجربات کی رنگارنگی چشمِ دل کو متحیر کردیتی ہے آپ کی شاعری میں رنگوں کی نیرنگی اسی بات کی غماز ہے کہ آپ کی فکر ونظر میں وسعت اور خیالات میں ندرت کے ست رنگ جلوے موجود ہیں مثال کے طور پر "لونیات"

کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

- مخلصانہ مشوروں کے مقتدی — سبز تھے کل تک کبودی ہو گئے
- قرمزی قطرے محرک تھے نہیں — ظلم کے رجحان ذاتی ہو گئے
- سرخ و سیاہ خون کی تائید میں کوئی — میزان حسن و قبح سے ہو کر گزر گیا
- بکثرت انفرادی شورو شر ہے — کبودی نقطہ نظر تا جور ہے
- خلافِ وضع کبودی حدود سے ملحق
  کوئی خلیجِ اُفق پاٹتا ہے میرے لئے
- آپ کا شہر ہو کہ ریگستان — سرخ مچھلی کی بات چلتی ہے

ساغر جیدی صاحب نہ صرف بلند و بالا اور قد آور شاعر ہیں بلکہ ایک حاذق طبیب اور ماہر حکیم بھی ہیں۔ اسی لئے آپ کی شاعری میں طب و حکمت کا جزوِ معتبر زہر کا ذکر تند بھی مختلف اجزائے ترکیبی کے ساتھ مل کر ذائقۂ قلب و نظر کے لئے معجون کا کام دے رہا ہے "سمیات" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

- نظر تتمہ مویشیوں پر — یہ سنکھیا کے غدیر ہیں سب
- ہزار ہا زہر کا ہو عادی — وثوق سے ظرف شیر لے جا
- زہر ہونے پہ وہ آمادہ ہیں — جن کی تحویل میں حنظل بھی نہیں
- میں اپنے زہر کی تمثیل کیا دوں — مگر آسماں پیش نظر ہے
- میں جن کی طرف سے مشتعل تھا — وہ زہر کے جام بے زباں ہیں
- زہر میں نرگس رہے یا ہے ساغر میں ختم
  اب کہ کوئی دیدہ ور ہاتھ نہیں آئے گا
- الماس میں بیش ہو کہ ناگن میں — ہر زہر کا حسنِ خاص بے شک ہے

طب و حکمت اور جنسیات چونکہ لازم و ملزوم ہیں اور ان میں چولی دامن کا رشتہ ہے لہذا ساغر جیدی جیسے جید شاعر و حکیم ماہر کے اشعار میں "جنسیات" کی بھینی بھینی خوشبو تخلیقی و باطنی سطح پر محسوس کی جاتی ہو تو قطعاً "لوالعجبی" نہ ہوگی۔ مثال کے لئے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

- کوئی ثالث نہ ہو تو اے ساغر — سوختہ خون بھی لچک جائے
- تضادِ رنگ و سمت و ذائقہ ہے قطرے قطرے میں
  جدا ہر نہر جسمانی کا پانی حق بجانب ہے
- مجھ کو اپنے لہو کی زباں دے — میں تیری خاک کا اشتہا ہوں
- منہ بند کنول ستّروں کا — چڑھتا ہوا آفتاب مانگے
- وہم سہی عندیۂ اشتہا — غنچۂ جہنم سے ہمیں کیا غرض
- ہر شام ڈھونڈلے گا ترا ذائقہ مجھے
  ہر زاویے سے دے گا تجرّد سزا مجھے
- ضعیف خاک پہ پوشاک منتشر ہوگی
  اہم مظاہرۂ رقص آب میں ہوگا
- بالجبر اس کے نرم و نازک جسم پر — پیوست ہیں خار و خسک برداشت کر
- خرد میں نور کا لشکر نظر میں گرد و غبار
  عجیب معرکۂ اشتہا ہے میرے لئے
- امشب بھی ننگے جسم کا — اک اژدھا مہمان ہے

ساغر جیدی صاحب کی شاعری میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ نے اپنے مجموعۂ کلام "اثبات" کی ستّر غزلوں کو چھبیس[26] مختلف و متنوّع اوزان

سے مزین کیا ہے، یہ امر قابلِ ستائش ہی نہیں بلکہ لائقِ تقلید بھی ہے۔ جب کہ ہمارے اکثر و بیشتر مشہور و معروف جدید شعرائے کرام نے بھی اپنی سیکڑوں غزلوں میں پانچ چھ اوزان ہی کا استعمال روا رکھا ہے حالاں کہ مانوس بحروں کی تعداد بھی اس سے کہیں زیادہ ہے۔

ساغر جیدی صاحب چوں کہ بالغ نظر فنکار اور ماہر عروض داں ہیں اسی لیے آپ نے بعض عروضی ہتھکنڈوں کو بھی بے تکلف استعمال کیا ہے اس بات کی گواہی مندرجہ ذیل اشعار کی منھ بولتی تصویر دے سکتی ہے۔

- تیزاب میں گھر ڈبو دیں ساغر ہم میں نفاق ہے کیا
- ساغر ادنیٰ کے بھی اوقات کیا اس کا ہر دن تری تحویل میں
- مجھ سے تمہیں شبنمی نکاس ملیگا تجھ میں فطرتی لباس ملیگا
- بہ احتیاط طویل و عریض تک لے جاؤ

کہ جتنا دم خم اپنی طناب میں ہوگا

غنودگی کے وسیلے سے جرم کرتا ہوں مفکروا شرعاً کیا سزا ہے میرے لئے

بہر حال ساغر جیدی صاحب نے ہر مقام و ہر سطح پر نادر اور انوکھے تشبیہات کا بھرپور استعمال کیا ہے لہذا راقم الحروف کی رائے میں آپ شہنشاہِ تشبیہات کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں، یہی وصفِ خاص آپ کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز و منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

اثرِ خامۂ علیم صبا نویدی

زندہ زبانوں کی عمر طبعی بہت طویل اور ہزاروں سال پر محیط ہوتی ہے۔ دنیا کی زندہ زبانیں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، جرمنی وغیرہ جلد عمر رسیدہ نہیں ہوتیں، ان میں قوت نمو کی فراوانی، صلاحیتِ رد و قبول اور قابلیتِ اخذ و انکار کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ اسی لئے عنفوان شباب سے عہد پیری تک کا سفر صدیوں کی شکست و ریخت اور قرنوں کی تعمیر و تجدید کی روش پہ طے ہوتا ہے۔ جس زبان میں تخریب و تعمیر کا متوازن تسلسل باقی نہ رہ سکے تو وہ زبان مردہ قرار دی جائیگی، یہی اصول زبانوں کی تاریخِ نشو و نما کے مطالعہ میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

زبانِ اردو مذکورہ فطری اصولوں سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی ہے۔ اردو کے عنفوانِ شباب کے دن یہی تو ہیں۔ "گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے" یہ قول کل کی طرح آج بھی سچ ہے۔ بولیاں صدیوں کی ریاضت و مزاولت کے بعد زبانیں کہلاتی ہیں یہ عہدِ طفولیت سے اسی وقت نکل آتی ہیں جب کہ ان کے دامن میں ادب کے چار چاند لگ جائیں اور ان کے خانۂ خالی میں ادبی سرمایہ جمع ہونا شروع ہو جائے۔ خدائے برتر کا

بے حد فضل و احسان ہے کہ اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت جلد اور بڑی تیزی سے جوان ہوئی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہو کہ اس کے مقدرمیں صوفیائے کرام کی دعائیں آئی ہیں۔ جن سایۂ عاطف میں اس کا بچپن گزرا ہے اور جن کے آغوش رحمت میں یہ پلی بڑھی اور پھولی پھلی ہے راقم الحروف کا تو یہی عقیدہ ہے کہ اردو کی یہ بیل ہرگز منڈھے نہیں چڑھتی اگر ان برگزیدہ ہستیوں کے دست شفقت کا حسین لمس اس کو میسّر نہیں ہوا ہوتا ۔ ماشاء اللہ ابھی ہزاروں سال بھی نہیں گزرے کہ اردو زبان بڑے بڑے سورماؤں سے ہاتھ ملانے لگی ہے دنیا کی اہم ترین زبانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے کے قابل ہوئی ہے اور ہزارہا مشکلات ومصائب کے باوجود راہِ ترویج کی بے انتہا ناہمواریوں کے باوصف خوب رواں دواں ہے، کہیں رکنے ستانے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔

بہرحال زبان وادب کی رفتار برقرار رکھنے کے لئے ہر دور میں ادباء و شعراء مسلسل جدوجہد اور انتھک محنت وریاضت کرتے آئے ہیں، تبھی تو اس کے سرمایہ میں روزافزوں ترقی ہو رہی ہے، اسی امر واقعہ کے پیش نظر راقم الحروف کی ہمیشہ یہی رائے رہی ہے کہ اردو کا خالق چاہے ادیب ہو یا شاعر، جو بھی ادب پارہ تخلیق کرے گا۔ اس میں اس بات کا ضرور خیال رکھے گا۔ کہ جس سے کسی نہ کسی سطح پر اردو کا بھلا ہو جائے۔ اور اس کی وہ تخلیق اردو کے سرمایہ میں اضافہ کا باعث بن جائے، اگر ایسا نہیں ہو رہا ہے تو ایسی تخلیق جو اندھی، گونگی اور بہری ہو اور وہ اپنے آباؤ اجداد کے لئے قابلِ فخر یا کم از کم دافع شر نہ ہو۔ تو اس کی زندگی سے موت بھلی ہوگی۔ راقم الحروف کو معاف فرمائیں کہ آج کا کوئی شاعر فرض کیجئے کہ روایتی غزل کہہ رہا ہے اور اس سے اردو زبان کا بھلا کسی بھی سطح پر نہیں ہو رہا ہے تو ایسے شاعر کے کلام کو سننے یا پڑھنے سے کیا حاصل! اس شاعر نامدار کے کلام کو پڑھنے کے بجائے حضرات میر وغالب واقبال کے کلام کی

تلاوت کریں تو اک گونہ ذہنی طمانیت اور قلبی راحت کا تو احساس ہو گا۔ جب تک زبان و ادب میں اس دور کی جدّت شامل نہ ہو گی۔ جس دور میں وہ سانس لے رہا ہے تو ایسے ادب کی تخلیق کا زبان کے لئے سمّ قاتل ہو گی، خصوصاً شاعری کے تعلق سے یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس میں 'ندرت خیال' یا جدّت الفاظ یا کم از کم کیفیت ادا ہو ورنہ اس تخلیق کا وجود لا یعنی اور ادب کے لئے' لاحاصل سمجھا جائے گا۔ ''خیال کی ندرت'' سے مُراد شاعر ایسا جدید تخیل پیش کرے جو نہ میر و غالب نے اور نہ اقبال نے پیش کیا تھا۔ ''الفاظ کی جدّت'' کے معنی یہی ہیں کہ ادب پارے میں ان کا استعمال اردو کی لفظیات میں اضافہ متصور ہوں۔ اور ان سے معانی کی نئی جہت کھل رہی ہو، ایجاز و اعجاز ان میں جادو جگا رہے ہوں۔ ''طرز ادا میں کیفیت سے یہی مراد لی گئی ہے کہ خیال قدیم ہی کیوں نہ ہو مگر اس کی ادائیگی اس کمال سے کی گئی ہو کہ جس کی وجہ سے ظاہراً نیا خیال محسوس ہونے لگے مگر بہ نظرِ غائر دیکھیں تو اس کے برعکس معاملہ ہو۔

بعض اہل علم شاعری میں اثر آفرینی کی بات کہتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ اثر آفرینی قاری یا سامع کو فوری متاثر کرنے کا نام ہے۔ حالانکہ یہ زعم حقیقت سے دور ہے، اس لئے کہ فوری اثر انداز ہونا وقتی حظ اٹھانے کا موقع فراہم کرنا ہے جو بہت جلد زائل بھی ہو جاتا ہے بسا اوقات تو بعد ازاں تکلیف دہ بن جاتا ہے درحقیقت اثر آفرینی ''تحریکِ فکر'' کا نام ہے جو شعر خوانی کے بعد قاری و سامع کو سوچنے اور بار بار پڑھنے پر مجبور کر دے اور ہر بار ایک لطیف و خوش گوار کیفیت کا احساس ہوتا رہے، اس تذکرے سے ذہن کی گرہیں کھلتی چلی جائیں۔ معانی و مفاہیم کے نئے جزیرے کی بازیافت ہوتی رہے۔ یہ کیفیت جس ادب پارے میں جس قدر توانا ہو گی اس کی تابندگی اتنی ہی دیرپا ثابت ہو گی۔ تمام دنیا کی ادبیات عالیہ میں سے 'قرآن شریف' میں یہ خصوصیت بکمال اتم اور ارفع و اعلیٰ ترین سطح

پر محسوس کی جاتی ہے، اس کلام کا قاری کبھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا، اس کی ظاہری جاذبیت و باطنی حسن پر اور اس کے صوری رنگ و معنوی کیفیت پر جب بھی غور و فکر کرے گا ایک جہانِ دیگر کا انکشاف ہوتا رہے گا۔ یہی خصوصیت و امتیازی وصف فنِ بلاغت کی اصل و بنیاد ہے اردو میں میر و غالب و اقبال کی شاعری اس لئے عظیم ہے کہ ان کے ہاں کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جس کے معانی کے ست رنگ جلوے دیدۂ بینا کو متحیر کر دیتے ہیں حضرت میر خدائے سخن کہلاتے ہیں، اس پر ہمارا ایمان ہے، جناب غالب و اقبال پیغمبرانِ اردو ہیں۔ جن کی پیروی جزوِ ایمانِ شاعری سمجھی گئی ہے ان حضرات کے بعد اقلیم اردو میں کوئی پیغمبر نازل کیوں نہیں کیا گیا، اس پہ بحث فی الحال نہیں ہے۔ میر و غالب و اقبال کی عظمت و رفعت اور سیادت و امامت پر امّتِ اردو کا اجماع ہو چکا ہے۔ جس کا انکار کوئی فاسق العقیدہ ہی کر سکتا ہے، لیکن تاحال فیض و فراق و جوش کے تعلق سے عظمت و تقدس پر اجماع منعقد نہ ہو سکا، شاید مستقبل میں کبھی نہ ہو۔ البتہ مذکورہ بزرگانِ اردو کے اولیائے سخن ہونے میں تقریباً اتفاق ہے ان حضرات نے اردو کے سرمایہ میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ فرمایا ہے جس کا اعتراف ہر کسی کو ہے۔ اولیائے اردو کی فہرست کافی طویل ہے اور ان کے درجات کا تعین جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اردو کے نامی گرامی اولیاء میں ولیٔ کامل، شیخ طریقتِ اردو جناب علیم صبا نویدی ہیں جس کی بیسیوں کتابیں اردو کے سرمایہ میں بلاشک و شبہ اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں، بالخصوص آپ کی غزلوں کا جدید مجموعہ "اثر خامہ" اپنی اثر آفرینی میں نمایاں دکھائی دیتا ہے، حسنِ ظاہر و نورِ باطن سے آراستہ یہ مجموعہ اہلِ علم اصحابِ بصیرت کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ "نعمت غیر مترقبہ" اس لئے کہہ

ہے کہ آج اردو دنیا میں بے حد و بے شمار دعوے دارانِ نبوت اردو" پیدا ہو چکے ہیں۔ مگر کسی کی کوئی تخلیق معجزاتی کیفیت نہیں رکھتی ہے اور نہ ان کی خلاقیت دعویٰ مع الدلیل ثابت ہو رہی ہے ہاں ایک آدھ شعر کا یا زیادہ سے زیادہ دو چار غزلوں کا بہترین سمجھا جانا " ولایت" کے لئے ہی کافی نہیں، چہ جائیکہ " نبوت" کا دعویٰ کیا جا سکے۔ اردو شعراء میں سے بہت ساروں کا بیڑا میر و غالب و اقبال کی اندھی تقلید نے غرق کر دیا ہے۔ جناب مظفر حنفی بڑے ذہین و زیرک شاعر ہیں، انہوں نے نہ صرف یہ کہا " عظمت سے ہٹ کے جدّت و ندرت کو ناپئے ۔ ہم اور چیز غالب و میر و فراق اور " بلکہ خود کر دکھایا ہے۔

بہر حال جناب علیم صبا نویدی کی "ولایت" میں برصغیر ہند و پاک بلکہ عالم اردو کے کسی بھی نقاد کو کلام نہیں ہے تمام آپکی شاعری کے معترف اور معتقد نظر آتے ہیں۔ مگر درحقیقت بے چارے علیم صبا نویدی پر یہ زیادتی ہے۔ خدائے اردو تو تنقید سے بالاتر سمجھے گئے ہیں اور پیغمبرانِ اردو معصوم گردانے گئے ہیں، البتہ اولیائ کے تعلق سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاں خوبیاں زیادہ اور خامیاں بہت ہی کم ہوتی ہیں اور وہ بھی دانستہ نہیں بلکہ نادانستہ طور پر ان کے کلام میں در آتی ہیں جو بشری تقاضے کے عین مطابق ہے۔

جناب علیم صبا نویدی کی شعری خصوصیات میں سے سب سے اہم "ندرت ترکیب" ہے۔ یعنی وہ دو مختلف لفظوں میں اس طرح پیوندکاری کرتے ہیں کہ اس سے جو " ندرت فکر" پیدا ہوتی ہے۔ وہ میر و غالب و اقبال کے ارواح کو ایک ابدی مسرّت سے ہمکنار کر دیتی ہے، کبھی اس ترکیبی عمل سے " جدّت الفاظ " کا نور فکر کی آنکھوں میں جلائے بصیرت پیدا کرتا ہے۔ جس سے آسمانِ اردو پر

نئے نئے چاند ستارے طلوع ہوتے نظر آتے ہیں۔ اور کبھی اس "ندرت ترکیب" کے طفیل ایک عجیب "کیفیت ادا" پیدا ہوتی ہے جس کا لطف و ذائقہ زبان اردو پر تادیر باقی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

لبِ نگاہ کا کچھ ذائقہ بدلنے کو — سرِ فلک بھی کوئی کھیل کود ہونا تھا

نیلے ارمانوں کی دھرتی پر صبا — کالی خواہش کا ہے منظر نقش گر

کھیتوں پہ اس طرح بچھیں سبز چادریں — پیلی رتوں کا اجلا مقدر بھی جل گیا

آنکھ نوید ی نورانی — دل ہے یقیناً سجدہ گھر

اکیلے پن میں تیرا نام لکھ کر — ہماری انگلیاں راتوں میں روئیں

تارے ٹوٹے تو سر ہوئے بیوہ — انگلیوں کا رباب غرق ہوا

ہم اپنے گھر میں سب سے جدا ہو کے رہ گئے — تاریک چاہتوں کی غذا ہو کے رہ گئے

انگلیوں نے جب بھی کی ہے رہبری — کاغذوں کے تخت پر اترا نصیب

لمحہ لمحہ میری ذہنی انگلیوں کی راہ سے — جتنا سرمایہ تھا فن کا، دور ہاتھوں سے گیا

ورق ورق میرے زخموں کا خواب پھیلا تھا

فریب خوردہ لہو کا عذاب پھیلا تھا

صبا نویدی پھینک آئے — میلی خوشبو، میلے خواب

جب سے ہوئی ہیں میری نگاہیں دراز قد — میرا ہر اک خیال فلک پوش ہو گیا

پیڑ بیوہ ہو گئے ہیں پتیاں سب اڑ گئیں — مسکراتے موسم کی دھجیاں سب اڑ گئیں

میں کبھی ذہن کے زینوں سے اتر آؤں گا

لا کے رکھ دے مرے ہاتھوں میں کھلونا اک دن

لبِ نصیب کی باہوں سے جب سرور اڑا — نہ جانے کتنے ہی ریکھاؤں کا غرور اڑا

اکتسابِ نظر

جناب علیم صبا نویدی کی یہی کیفیت یعنی "ندرت ترکیب" معنی آفرینی کا سرچشمہ ہے جس سے قاری و سامع کے ذہن و دل نہ صرف سیر آب ہوتے ہیں۔ بلکہ ان میں "ہل من مزید" کی خواہش بھی جنم لیتی ہے۔

نہ روشنی نہ اندھیرا نہ دود ہونا تھا
مجھے بھی تیری طرح لاوجود ہونا تھا

- در و دیوار میں جو تھا اکیلا
  وہ رشتہ اب کہانی ہو گیا ہے
- عکس میرا آئینہ در آئینہ
  فکر کا تابندہ گوہر نقش گر
- آسمانوں کی طرف پاؤں جماتے نکلے
  پھول والوں کا وطن لوگ جلانے نکلے
- جسے نصیب تھا ادراک و آگہی کا سفر
  ورق ورق وہ کہیں باب باب پھیلا تھا
- آج سر سے اتر کے آہستہ
  انگلیوں سے مری دماغ لگا
- ترے نصیب کے گھر کا دماغ جاگا ہے
  سکونِ قلب و نظر کا چراغ جاگا ہے
- ورق ورق پہ اچانک بکھر گیا ہے آج
  مرا شعور ہمیشہ جو میرے اندر تھا

- ہر ایک بھید کا میں نے کیا ہے چاک لباس
بس ایک درد کا سرمایہ تھا، جو دب کر تھا

- ہمارے بعد کوئی شعلہ ساماں
افق کی سیڑھیاں چڑھتا نہیں ہے

- بسائے ہم نے ہی خوابوں کے شہر، پیار کے گاؤں
زمانہ ساز تھے، بے خانماں ہوئے ہم لوگ

جناب علیم صبا نویدی کا یہی کلیدی وصف ہے جس سے فکر و نظر کے مغلق باب وا ہو جاتے ہیں۔ اور اسی صفتِ خاص کی ضو پاشی دل و دماغ کے تاریک زاویوں کو منور و تابناک کرتے دکھائی دیتی ہے۔ علیم صبا کے طنزیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں کہ اس میں بھی آپ کی یہی خصوصیت (ندرتِ ترکیب) دامنِ دل کی کشش کا سبب ہے طنز کی برش اس وصفِ خاص سے مل کر اثر انگیزی میں سرعت و حدت پیدا کرتی ہے۔

- چند ریکھاؤں میں لکھا گیا ہے
یہ اگر سچ ہے پھر خدا کیا ہے

- صبا نویدی پاگل ہے
بننا چاہا تھا دریا

- جسم و جاں کا سفر عذابوں تک
ڈر خداؤں کا بارگاہوں تک

- سچائی کے منڈوے تلے
جھوٹے لوگ ہیں جھوٹا شہر

- تمام نیکیاں دریا میں پھینک دی ہیں نے
مرے گناہ کا ہر سو حساب پھیلا تھا
- نہ آسماں نہ سمندر نہ چاند سورج کا
بس آس پاس کے شہروں کا ڈھنڈورا کو ہے
- تیز تر ہیں جب اُڑائیں جنت کی
نیک نامی کیوں پسِ دیوار ہے

تھا غبار آلود شاہی طمطراق
زنگ خوردہ ہر نظر شمشیر تھی
- نیکیوں سے صبا گلے ملنے
لوگ آئے ہیں شہر انجب سے

شاعر نہ صرف اپنے اطراف و اکناف کی آب و ہوا کا عکاس اور اپنے قرب و جوار کی فضا کا غماز ہوتا ہے بلکہ "آفاق کے ساتھ "انفس" کی سیر کرتے ہوئے اسکے عجائبات کا چشم دیدہ گواہ اور باطن کے رموز و اسرار کا حاکی و راوی بھی بن جاتا ہے۔ یہی اچھی اور بڑی شاعری کی علامت ہے کہ وہ کسی ایک خاص جذبے کی توثیق پر اکتفا نہیں کرتی ہے بلکہ ہمہ جہت تجربات و مشاہدات کی بھرپور تصدیق بھی کرتی ہے۔

جناب علیم صبا نویدی نے اپنی اسی خصوصیت کے ساتھ دروں بینی کے سفر میں حیرانی کا اظہار کیا ہے یہ حیرانی باعث پریشانی نہیں بلکہ یہ ایک شعوری ادراک ہے جس کی عطر بیزی مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔ مثلاً

- میں نہ تھا تو میرے اندر کون تھا
قطرہ قطرہ اک سمندر کون تھا

- میں تو باہر ہوں ہر طرف موجود
پھر یہ اندر کا سلسلہ کیا ہے
- جو سماں باہر ہے میرے ، وہ سماں اندر نہیں
لامکاں باہر ہوں لیکن لامکاں اندر نہیں
- میرا ظاہر مجھ پر حیراں
میں جب بھی اندر سے نکلا
- خبر نہ چھت کو ، نہ دیوار کو ، در کو ہے
میں اپنے گھر میں ہوں میری تلاش گھر کو ہے
- میرا اندر ہے مختلف سب سے
میں زمیں پر ہوں اک نئے ڈھب سے
- برسوں ترس گیا ہوں ملاقات کے لئے
مجھ میں وہ چھپ کے بولنے والا عجیب تھا
- میں بھی ششدر ہوں وہ بھی ہیں حیراں
یہ مہک درمیان کس کی ہے
- اپنے ذہنی ارتقاء کا زائچہ دیکھے گا کون
معتبر ہم ہیں مگر یہ دور ہے استاد کا

علیم صبا نویدی کا خامہ اثر آفرینی کے ساتھ آزادروی کا بھی متمنی ہے اسی لئے ان کے ہاں "جنس" کی ہلکی اور لطیف حدت کے زاویے بھی روشن نظر آتے ہیں مگر اس ماحول میں بھی آپ اپنی خصوصیت یعنی "ندرت ترکیب" سے پہلو تہی نہیں کرتے ہیں۔

- صدف میں گہر جب سے روشن ہوا
  ضرورت کا آسودہ ساون ہوا
- صدف میں گوہر کا نور ہوگا
  بسنت رُت کا غرور ہوگا
- خشک کنواں تھا بستی کا
  گھر میں پھیلا تھا دریا
- سج دھج کے اک کرن میرے بستر کو چھو گئی
  یادوں کے سب جلوس ہوا ہو کے رہ گئے
- ٹھنڈے بستر، جلتے خواب
  جسم پرانے، میٹھے خواب
- درمیانی فاصلے طے ہو گئے
  چاہتوں کے پاؤں میں زنجیر تھی
- کیا پتہ تھا، تری جلتی ہوئی سانسوں کی قطار
  مری سانسوں پہ ہی ڈالے گی بچھونا اک دن
- ہماری عمر کی زرخیز سرزمیں بھی دیکھ
  لہو کے پیڑ سے سرسبز پتیاں نکلیں
- خوشبو سے رشتہ ٹوٹا
  رات گئے بستر رویا
- سوکھی ندی میں غوطہ لگانے کے بعد ہی
  آہستہ سرد اُس کے لہو کی تپش ہوئی

جناب علیم صبا نویدی صاحب منصبِ ولایت پر فائز ہونے کے باوجود بشر ہی تو ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں بشری جبلت کے طور پہ چند خامیوں کا در آنا بوالعجبی نہیں ہے۔ یہ علیم صبا جیسے پرگو شاعر کے لئے لازمی ہے مگر آپ کے کلام میں خوبیوں کی کثرت اور سیلابِ حسنات کا زور اس قدر ہے کہ اس میں کوتاہیوں کی قلت اور قلم کے زلات ایک بے حقیقت کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

- شعری اظہار صبا فکرِ جہانی کی دلیل — فہم سے دور مری ذات کے گھر کا منظر
- اس پیڑ کے ہمراہ تھیں موسم کی دعائیں — جس پیڑ میں ہنستے ہوئے پتے تھے زیادہ
- جب سے سفر کا ہاتھ مرے ہاتھ آگیا — سب آسمانی دروازے وا ہو کے رہ گئے
- اُتر کر خواہشیں جسموں میں روئیں — نہ رونا تھا جنھیں، خوشیوں میں روئیں
- جب آفتابی شہر ملوا تھا لہولہان — تھی موج موج آگ سمندر بھی جل گیا
- موجوں کا پیرہن پہنے — گویا مچھ بھنور سے نکلا
- سانس در سانس لہو لہو نورانی — اپنے اندر وہ سبز باغ لگا

عیب و ہنر کا سرمایہ آخر دم تھال — پیرہنِ سفید میں روپوش ہو گیا

- یہ میرا دل بھی سراپا مزار سے صبا — لگا ڈُ کتبہ کسی نام کا مرے اندر
- کس کس نے میرے روپ کی تصویر کھینچ لی — گویا بدن سے چادرِ تقدیر کھینچ لی

بہرحال علیم صبا نویدی کی شاعری اردو زبان میں اضافہ ہی نہیں بلکہ بلاشک و شبہ ادب پر ہر اک گونہ احسان بھی ہے۔ جس کا اعتراف نہ کرنا شیرِ چشمی کی دلیل ہے۔ آپ کے شاعرانہ کمال پہ ایمان لانا مومنِ اردو کے لئے لازمی ہے اور اس کا انکار کفرانِ نعمتِ اردو متصور ہوگا۔

علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری

اردو شاعری کے اصناف جیسے قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ میں سے صنفِ قصیدہ کی ایک معنوی قسم "نعت" ہے۔ اصطلاح میں نعت ایسے موزوں کلام کا نام ہے جس میں آقائے نامدار سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف باخلاص نیت کی گئی ہو۔ راقم الحروف کے نزدیک اخلاص کی شرط اس لئے اہم ہے کہ اخلاصِ نیت ہی سے عشقِ صادق جنم لیتا ہے۔ اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قلب میں جاگزیں کئے بغیر صحیح معنوں میں نعت شریف کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ نعت شریف کی اثر آفرینی کا مکمل دارومدار سچی عقیدت اور کامل محبت پر ہے شمعِ محبت کی لو جس قدر تیز ہوگی اس کی ضیا پاشی بھی اسی مقدار اپنی جولانی دکھائیگی۔ عشقِ رسولؐ کی خوشبو بشری کثافتوں میں گھل مل کر لطافتِ ملکوتی سے آدم زاد کو ہمکنار کردیتی ہے۔ اسی لئے اسلام نے محبت رسولؐ کے مقابلے میں ہر الفت کو کالعدم کہا ہے۔ حبِ رسولؐ کی اہمیت کے پیشِ نظر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود اس کی تلقین ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احبّ الیہ من

والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین ۔ (تم میں سے کوئی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی جان، اس کے ماں باپ بچے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس کا محبوب نہ بن جاؤں۔) بقول شاعر ؎

آپؐ پر قربان ہیں سب جان ومال ووالدین
اصل ایمان ہے محبت سرورِ کونینؐ کی

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنے محبوبؐ کو محمدؐ احمدؐ، مزمل، مدثر وغیرہ والہانہ خطابات سے سرفراز فرما کر بنی نوعِ انسان کو نعت گوئی کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ تاریخِ ادب میں اوّلین نعت گو ہونے کا شرف حضرت ابوطالب کو حاصل ہے۔ کیوں کہ حضرت ابوطالب ہی نے سب سے پہلے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں قصیدہ کہا تھا۔ جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

وابیض یستسقی الغمام بوجہہٖ
ثمال الیتٰمیٰ عصمۃ للارامل

(آپؐ کا پُرنور چہرہ کہ جس کے وسیلے سے بادلوں سے پانی طلب کیا جاتا ہے اور آپ یتیموں کے لئے سہارا اور بیواؤں کے نگہبان ہیں۔)

اردو ادب میں سب سے پہلے مربوط انداز میں نعت شریف کہنے کی سعادت قلی قطب شاہ معانی والیٔ گولکنڈہ (۱۶۱۱ء تا ۱۷۸۰ء) کے حصّے میں آئی ہے۔ جس نے غزل کے رنگ میں بہت سی نعتیں کہی ہیں۔ کلیات قلی قطب شاہ، مرتبہ ڈاکٹر سیّدہ جعفر، کا یہ شعر کس قدر خوبصورت ہے، ملاحظہ ہو: ؎

چاند، سورج روشنی پایا تمہارے نور تھے
آبِ کوثر کوں شرف تھڈی کے پانی پور تھے

اکتسابِ نظر

نعتِ شریف کا میدان ان معنوں میں بے حد وسیع ہے کہ حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل و شمائل لامحدود ہیں۔ یہ سرسبز و شاداب نورانی رہگزر ہر عاشق کے لئے اور قیامت تک کے لئے کھلی ہوئی ہے مگر یہاں صد دیوانگی کے باوجود یک گونہ فرزانگی ہمیشہ درکار ہے۔ اس راہ کا راہی ہر دم، قدم قدم سنبھل سنبھل کر چلتا ہے بقول عرفی ے

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است، نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

جنابِ علیم صبا نویدی کا پیشِ نظر مجموعہ "ن" ہے جو دراصل قرآن شریف کے حروفِ مقطعات میں سے ایک ہے۔ جس کی صحیح مراد بقول جمہور مفسرین اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ مگر بعض صوفیاء کے نزدیک یہ حرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نورانی کی علامت ہے۔ گویا "ن" لفظ نور کا مخفف ہے۔ اس حیثیت سے "ن" نعتیہ مجموعہ کے لئے بہت ہی خوبصورت اور موزوں نام ہے۔

یوں تو ہر طرح کی شاعری الہامی ہوتی ہے بالخصوص نعتیہ شاعری کے لئے جب تک فضلِ خدا و لطفِ حبیبِ خدا نہ ہو نعت کا ایک شعر تو کجا آدھا مصرعہ بھی کہنے کی مجال کسی میں نہ ہوگی اسی لئے بہت سارے شعرائے کرام کے دیوانوں میں غزلوں، نظموں، کی کثرت و بہتات ہوتی ہے مگر ان کے ہاں نعتیہ کلام کی قلت بری طرح کھٹکتی ہے

جنابِ علیم صبا نویدی اس اعتبار سے بہت ہی خوش قسمت و نیک بخت ہیں کہ ان کا نعتیہ مجموعہ "ن" "مراۃ النور" اور "نور السمٰوات" کے بعد تیسرا ہے

۲ے ادب میں نعت شریف کا مقام ماہنامہ فن کار حیدرآباد جنوری ۱۹۸۷ء

۱ے روح المعانی : سورۃ القلم

ڈاکٹر عبدالمغنی پٹنہ کا یہ دعویٰ کہ " اس دور میں سب سے زیادہ نعتیں کہنے کا سہرا عبدالعزیز خالد (پاکستان) کے سر ہے" علیم صبا نویدی کے نعتیہ کلام سے کما حقہ' ناواقفیت کی دلیل ہے۔ جناب خالد کا نعتیہ کلام " فارقلیط " کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مگر علیم صبا کے تین مجامیع کہ جس میں سانیٹ کے فارم میں نعت شریف کا اولین مجموعہ " نور السملوٰت " بھی شامل ہے۔ جس کی پذیرائی' اہلِ علم کے درمیان بڑے وسیع پیمانے پر ہوئی ہے، اس بات کے شاہد ہیں کہ قلبِ صبا پہ بارانِ فضلِ خدا اور فیضانِ حبیبؐ خدا خصوصی طور پر ہوتا رہتا ہے ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جناب علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری کا کلیدی لفظ " نور " ہے۔ جس سے نعت میں ان کی انفرادیت روشن ہوتی ہے اور اسی کلیدِ نورانی سے مقام صبا کے تشخص و تعین کے وقت درپیش بعض مغلق ابواب بھی کھلتے ہیں گویا ان کی تمام نعتیہ شاعری کی اصل و اساس وہ احادیثِ شریفہ ہیں۔ جن سے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبداءِ نورانی و منبعِ تجلیاتِ رحمانی ہونے کا ادراک و عرفان ہوتا ہے۔ حضور اکرمؐ کا فرمانِ واجب الاذعان ہے۔ (1) اول ما خلق اللّٰہ نوری (2) انا من نور اللّٰہ وکل شئ من نوری : یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کی تخلیق کی۔ میں اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوں اور ہر چیز میرے نور سے ہے۔

مذکورہ احادیث کے پیشِ نظر بعض عرفائے محققین کی رائے ہے کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا جوہرِ تخلیق نور ہے۔ البتہ بشریت آپؐ کی صفت ہے جو آپؐ سے بعض خاص حالات میں جدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ہماری اصل و اساس بشریت ہے مگر نورانیت ہمارے لئے صفت کا درجہ رکھتی ہے۔ اصل جوہر کے ختم ہو جانے سے

اکتسابِ نظر

ذات بھی ختم ہو جاتی ہے مگر صفت کے کالعدم ہو جانے سے ذات معدوم نہیں ہوتی۔ غالباً
انہیں نکات کے پیشِ نظر جناب علیم صبا نے لفظ نور کا ہمہ جہتی استعمال بڑی خوبصورتی کے
ساتھ کیا ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیشِ خدمت ہیں۔ ؎

- وہ نورِ حق کا مصحف ہیں سراپا نظر آیاتِ قرآنی ہے دیکھو
- نظر ڈالو تو روئے مصطفیٰ پر جمالِ نورِ یزدانی ہے دیکھو
- سر بہ سجدہ ہو گئے ہیں ماہ و انجم، کہکشاں

سرورِ کونین کے نوری سفر میں دیکھنا

- آپؐ آئے کیا مبارک ہے گھڑی دامنِ دل نور سے بھرپور ہے
- ہر طرف ظلمت سیاہی کے سوا کچھ بھی نہ تھا

آپؐ نے نور کا فوارہ اُچھالا، دل میں

- دیکھتا دیکھتا آ گئے ہیں صبا نور کے پیرہن میں معطر نبیؐ
- نورِ اول ہیں، نورِ آخر آپؐ شمعِ نورِ صدیٰ، سلام علیک

جناب صبا نویدی کی نعتوں میں خوشبوئے مصطفیٰؐ کی مہک ورق ورق محسوس
ہوتی ہے، ان اشعار کی عطر سے ہر عاشقِ رسولؐ اپنے مشامِ جاں کو معطر کرتا رہتا ہے۔ چند
اشعار جس سے نہ صرف لفظاً بلکہ حقیقتاً بوئے مصطفیٰؐ آتی ہے ملاحظہ ہوں: ؎

- ہر دل میں، ہر دماغ میں، خوشبوئے مصطفیٰؐ

ارض و سما کا نور بنا روئے مصطفیٰؐ

- جس روز ختم ہو گا میری زیست کا سفر

نکلے گی مری سانسوں سے خوشبوئے مصطفیٰؐ

- جلوۂ نورِ محمدؐ ہی سے روشن ہے جہاں
  پھول ہیں پھل ہیں ہر اک ذرّہ میں خوشبو ہے رواں
- ذکرِ سلطانِ زمنؐ کے فیض سے
  خوشبوؤں کا پاک ڈیرا دل میں ہے
- شہرِ نبیؐ کی سمت اٹھے ہیں مرے قدم
  بھرپور خوشبوؤں سے مرا راستہ ہے آج

نعت رسولؐ کے اظہار کے قدیم اور مانوس ڈگر سے ہٹ کر علیم صبا صاحب نے اپنی ایک نئی راہ بنائی ہے جس پہ چلتے ہوئے خود علیم صاحب کو کہیں کہیں لڑکھڑاہٹ کا احساس ہوا ہوگا، مگر وہ بالآخر اس راستہ کو مانندِ صبا عبور کرتے ہوئے منزلِ مقصود پہ کامیابی کے ساتھ پہنچ گئے ہیں۔ اس جدید راہ پہ منور نقوشِ صبا کے بعض نمونے چشمِ دل کو منور کر دینے کے لئے کافی ہیں ؎

- اظہار کا احسان ہے نہ لفظوں کا کرم ہے
  جذبات کو گہرائی محمدؐ سے ملی ہے
- دعا مانگی نہ منت کی نہ دامن کو پسارا ہے
  درِ اقدس پہ سر رکھ کر ہمیشہ رو دیا میرا دل
- مجھ سے پہلے میری اپنی پتلیاں — کر چکی ہیں تورِ احمدؐ کا طواف
- خشک بادل کو میسر کب ہوا — مصطفائیؐ تو زی پر گر کا طواف
- کیا درودِ مصطفےٰ کا ہے کمال — ہر کنواں اب شربتی ہونے لگا
- کیا مبارک ہر قدم ہے آپؐ کا — ذرہ ذرہ پہ بتی ہونے لگا
- جبینوں میں سفیدی کیا ہے جب — لہو میں مصطفائی ہے روانی

سینے میں جب سے رکھا چراغِ محمدیؐ
پوشیدہ جو تھا مجھ میں وہ کافر ہی مر گیا

جنابِ علیم صبا کے ہاں بعض مقامات پر خیالات کی تکرار کھٹکتی ہے مگر اس کو تحدّ مکرر کے طور پر قبول کرنے میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ یہ اسلئے کہ اشعار کی ظاہری مشابہت کے باوجود باطنی طور پر ان کا ذائقہ عقیدت کے کام و دہن کو بے مزہ نہیں کرتا ملاحظہ ہو

- چار سو نورِ درودِ مصطفیٰؐ   پھیلا یوں محفل سہانی ہو گئی
  درودِ مصطفیٰؐ کا نور پھیلا   فضا میں لطفِ رحمانی ہے دیکھو
- ہر پھول کی قسمت ہے محمدؐ سے معطر
  ہر باغ کو رعنائی محمدؐ سے ملی ہے
- محوِ ذکرِ احمدی ہیں پھول پھل   ذرہ ذرہ باغ کا مسرور ہے
- پھولوں پتوں کو تلاوت کی مہک دے کر صبا
  جو کسے ذکرِ محمدؐ وہ شجر افضل ہے
- نکہت و نور کا بے کراں آسماں
  حسنِ قرآں کے بے شک ہیں مظہر نبیؐ
- آپؐ کی ذات مبارک کی ہو کیا حمد و ثنا   جسم نورانی ہے سینہ ہے سراپا قرآں

بہر حال جنابِ علیم صبا نویدی کا پیشِ نظر نعتیہ انتخابِ کلام جدید نعتیہ شاعری میں سنگِ میل ہے جس کی وقعت و اہمیت اصحابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے۔

IKTESAB-E-NAZAR

BY

RAHI FIDAI, M.A.,


مولانا راہی فدائی کی تبحر علمی، نکتہ رسی اور ژرف نگاہی سے اردو
ادب کی ساری دنیا نہ سہی آدھی سے زیادہ ادبی دنیا تو ضرور واقف ہے۔ اور یہ بات بہت اہم ترین
ہے کہ مولانا راہی کی شاعری کی عربی لفظیات اور ان نامانوس لفظیات کی تراش و خراش و عمومیت معنویت
سے نابلد ہونے کے باوجود ہمارے اکثر و بیشتر اکابرین ادب نے ان کی شاعری کی ان خصوصیات سے بھرپور استفادہ
کیا ہے اور ان عربی لفظیات سے اردو کے شعری ذخیرے کو بہت وسعت اور کشادگی بھی ملی ہے۔


آج کے مصلحت پسند نقادوں کی کھیپ میں راہی کے شعری اثاثہ کو
نیک نیتی سے پرکھنے اور صحیح ادبی دیانتداری سے تنقیدی جائزہ لینے والا نقاد ہنوز موجود نہیں ہے۔


اب رہی مولانا راہی کے تحقیقی اور تنقیدی پس منظر میں اجاگر ہونے والی
جستجو کاوش اور [illegible] صلاحیتوں کی بات :


تحقیق میں مولانا راہی نے جنوبی ہند کے قدیم نایاب اور نادر مخطوطات
سے نامعلوم ان دیکھے جواہر پارے ڈھونڈ نکالے ہیں جن کی وجہ سے تحقیق کے باب میں نئی روشنی ہی نہیں
پھیلی بلکہ ہمارے تحقیقاتی خزانے میں انمول اضافہ ہوا ہے۔


تنقید کے تعلق سے بھی راہی کی سوجھ بوجھ نے فنی روایات کے دائرے میں
ہوتے ہوئے بھی اس دائرے سے اونچا اٹھ کر جدیدیت کے مدار کا بڑی سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ طواف کیا ہے
بعض مضامین میں انہوں نے تخلیق کار کی تخلیقی اپج اور فکر اور شناخت کا تجزیہ کرتے ہوئے جن نتائج کا استنباط
کیا ہے وہ واقعی ہمارے آج کل کے نام نہاد تنقید لکھنے والے خسروانِ مملکتِ ادب سے مختلف فرد ہیں

علیم صبا نویدی

Publisher :
Tamilnadu Urdu Publications Madras 600 002